مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری فکری و فنی تقابل

(چند ہم عصر اور گنجینہ گوہر کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد جمیل

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر ۲۰۱۹ء

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فکری و فنی تقابل

(چند ہم عصر اور گنجینہ گوہر کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

محمد جمیل

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **مولوی مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فکری و فنی تقابل**

(چند ہم عصر اور گنجینہ گوہر کے حوالے سے)

پیش کار: محمد جمیل رجسٹریشن نمبر: 1377/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر محمود الحسن _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں، محمد جمیل حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

محمد جمیل

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرستِ ابواب	V
Abstract	VIII
اظہار تشکر	IX
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف ii۔ بیان مسئلہ	۱
ii۔ مقاصد تحقیق، تحقیقی سوالات، نظری دائرہ کار، تحقیقی طریقہ کار	۲
vi۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق، تحدید، پس منظری مطالعہ	۳
x۔ تحقیق کی اہمیت	۴
ب: خاکہ نگاری اور دیگر اصناف نثر	۴
ناول اور خاکہ	۸
خاکہ اور افسانہ	۹

خاکہ اور ڈرامہ	۱۰
خاکہ اور انشائیہ	۱۱
خاکہ اور سوانح عمری	۱۳
خاکہ اور مکتوب نگاری	۱۶
فن خاکہ نگاری	۱۸
ج۔ مولوی عبدالحق تعارف و خدمات	۲۵
مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات	۲۸
مولوی عبدالحق بطور خاکہ نگار	۲۹
د۔ شاہد احمد دہلوی: تعارف و خدمات	۳۰
ادبی خدمات	۳۳
تصانیف، تراجم خاکے	۳۴
افسانے، مضامین، رپورتاژ / روداد،	۳۵
شاہد احمد دہلوی بطور خاکہ نگار	۳۶
حوالہ جات	۳۹
باب دوم: مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فکری تقابل	۴۲
الف۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا فکری جائزہ	۴۲

سیاسی و سماجی فکر	۴۳
علمی و ادبی فکر	۵۱
مذہبی فکر	۵۷
ب۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری جائزہ	۶۱
سماجی و سیاسی فکر	۶۲
علمی و ادبی فکر	۶۹
مذہبی فکر	۷۷
ج۔ مولوی عبد الحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا تقابل	۸۲
اشتراکات	۸۲
افتراقات	۸۵
حوالہ جات	۸۷
باب سوم: مولوی عبد الحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فنی تقابل	۹۱
الف۔ مولوی عبد الحق کی خاکہ نگاری کا فنی جائزہ	۹۱
اختصار	۹۲
سراپا نگاری	۹۸
اسلوب	۱۰۱

واقعات نگاری ۱۰۷

ب۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فنی جائزہ ۱۱۵

اختصار ۱۱۷

سراپا نگاری ۱۲۲

اسلوب ۱۲۸

واقعات نگاری ۱۳۷

ج۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فنی تقابل ۱۴۶

اشتراکات ۱۴۶

افتراقات ۱۵۱

حوالہ جات ۱۵۵

باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات ۱۵۹

مجموعی جائزہ ۱۵۹

ب۔ نتائج ۱۶۴

ج۔ سفارشات ۱۶۵

کتابیات ۱۶۶

Abstract

This thesis comprises four chapters. First chapter consists of introduction of Maulvi Abdul Haq and Shahid Ahmed Dehlvi and fundamental discussions of drafting (Khaka Nigari). The persons of Maulvi Abdul Haq and Shahid Ahmed Dehlvi and their literary services will be discussed in this chapter. Along with this the fundamental principles of drafting will be discussed in detail.

The second chapter consists of imaginative comparison of Maulvi Abdul Haq and Shahid Ahmed Dehlvi's drafting. In this chapter the drafting of Maulvi Abdul Haq and Shahid Ahmed Dehlvi will be assessed with respect to imaginative aspects like social, political, educational, literary and religious perspectives. At the end of chapter both writers will be compared in the light of ….. Comparison.

Third chapter consists of artistic comparisons of Maulvi Abdul Haq and Shahid Ahmed Dehlvi. In this chapter the important aspects of drafting of both writers like brevity, sarapa nigari, usloob, material and events will be discussed in detail. In the last the artistic comparison of both writers' drafting will be presented.

In the Fourth Chapter an overall analysis has been made. This chapter is based on a comprehensive study ,Conclusions and recommendations deduced as a result of the overview of the discussion in the first three chapters, reaching a summarize and compiling a few suggestions at the end.

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی بدولت ممکن ہوئی۔ جس کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا اور بے حد شکر گزاری واجب ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پہ بھی بے حد و بے شمار درود و سلام جن کی محبت مسلمانوں کا فخر اور اثاثہ ہے۔ ازاں بعد شکر گذار ہوں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے صدر شعبہء اردو ڈاکٹر عابد حسین سیّال، کو آرڈینٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور تمام اساتذہ کرام کا، جن کی رہنمائی اور شفقت ہر لمحہ مجھے میسر رہی۔ خاص طور پہ نگران مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن کا انتہائی ممنون ہوں۔ جنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر موقع پر میرا ساتھ دیا، ہر ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد کے لیے موجود اور دستیاب رہے۔ ان کا مشفقانہ رویہ مجھے کام کرنے کے لیے تقویت مہیا کرتا رہا اور میرا کام آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا۔ موضوع کا انتخاب، خاکہ کی تیاری ،مواد کا حصول یا دیگر فنی و تکنیکی معاونت کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ والدین کی پر خلوص دعائیں ان تمام مراحل میں میرے ساتھ رہیں جن کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن کا سایہ تادیر ہمارے سر پہ رکھے۔ امین۔ اسکالرز حامد محمود،، محمد زبیر اور قاضی سلطان محمود سمیت میں تمام دوست احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ بطور خاص مخلص دوست عرفان طارق کا جنھوں نے ایم اے اردو کرنے کے بعد ایم فل کے لیے نہ صرف تحریک دی بلکہ جب بھی میں نے مشاورت و رہنمائی کے سلسلے میں ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے انتہائی خلوص اور مروت کا برتاؤ کیا۔

آخر میں اپنے بھائیوں اور اہلیہ کا میں ضرور شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں یکسوئی سے کام کرنے کے لیے ماحول فراہم کیا اور دیگر گھریلو مصروفیات سے فرصت مہیا کی اور میرے کام کے حوالے سے مجھے تحریک دی تاکہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ تمام کو جزائے خیر دے۔ امین

محمد جمیل

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت کافی مستحکم ہے ۔خاکہ نگاری کی بدولت کسی بھی شخصیت کی مستور جہات تک رسائی ہو سکتی ہے اور کسی شخصیت کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا پس منظر معلوم کیا جا سکتا ہے۔اس صنف کے فروغ اور ترویج کے لیے اس صنف پر تحقیقی اور تنقیدی کام کی بہت ضرورت ہے تاکہ خاکہ نگاری جیسی صنف کو ترویج دی جا سکے ۔اردو کے کئی ادیبوں نے اس صنف میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ مختلف ادیبوں نے اس صنف کو مختلف انداز سے برتا ہے۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی اردو ادب کی اس مقبول صنف کا مضبوط اور بنیادی حوالہ ہیں۔ دونوں کے ہاں شخصیت کی پیشکش بابت خاصا تنوع موجود ہے۔ آپ دونوں نے مخصوص انداز فکر اور اسلوب کے مطابق خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں فکر اور فن کی رو سے اشتراکات اور افتراقات پائے جاتے ہیں۔

مجوزہ مقالے میں مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کی خاکہ نگاری میں ان کے فن اور فکر کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے فکری و فنی اشتراکات اور افتراقات کو سامنے لایا گیا ہے۔

ii ۔ بیان مسئلہ

اردو میں غیر افسانوی ادب کی اہم قسم سوانحی ادب ہے اور اس کی اہم صنف خاکہ نگاری ہے ۔جسے دلچسپ اور مختصر ہونے کی بنا پر افسانہ نگاری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک داستاں سے ناول اور پھر ناول سے افسانے کا سفر طے ہوا اسی طرح ایک طویل سوانح کے مقابلے میں خاکہ نگاری کی صنف متعارف ہوئی اور اس میں اختصار اور دلچسپی کے عنصر کو خاص اہمیت دی گئی لیکن چونکہ یہ فن ابھی زیادہ قدیم نہیں ہے اس لیے ہر لکھنے والے نے اسے نئے انداز سے برتا ہے اور جس کی بنا پر یہ بعض اوقات اپنی قریب کی اصناف میں ممیز بھی نہیں ہو پاتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے سوانحی ادب میں صنف خاکہ ایک دلچسپ صنف ہے۔

اس میں فکر اور فن کے حوالے سے بھی تنوع موجود ہے۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں ان دونوں کے ہاں فکر اور فن کے حوالے سے کچھ اشتراکات اور افتراقات ہیں۔ جن کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی ضرورت ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق

۱۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا فکری اور فنی جائزہ لینا

۲۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری اور فنی جائزہ لینا

۳۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری اور فنی تقابل کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات

۱۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کے فکری پہلو کون کون سے ہیں؟

۲۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کے فنی عناصر کیا ہیں؟

۳۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے ہاں کیا اشتراکات ہیں اور کیا افتراقات ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار

خاکہ نگاری ایک اہم صنف ہے۔ اردو خاکہ نگاری کو اگرچہ متعدد خاکہ نگاروں نے مختلف انداز سے برتا ہے اور شخصیت کی پیشکش کے حوالے سے تنوع موجود ہے۔ بعض نقادوں اور محققین نے اس کے فنی حوالے سے معیارات مقرر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بشیر سیفی کی کتاب ''خاکہ نگاری فن اور تنقید'' اور شاہد حنائی کی کتاب ''اردو خاکہ نگاری'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے صاحبِ طرز خاکہ نگاروں نے دیباچوں میں بھی اصول و ضوابط متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی فنی معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں فکر اور فن کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ ان معیارات کی روشنی میں مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا تقابل کیا جائے گا۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر مقالے میں معاصر کتب سے مدد لی جائے گی اور اس کے علاوہ خاکہ نگاری کے فکر اور فن کے بارے میں تحریروں سے استفادہ کیا جائے گا۔ یوں یہ ایک دستاویزی طریقہ کار کہلائے گا۔ اس کے علاوہ قدم بہ قدم

جس طریقہ کار کو زیادہ مناسب خیال کیا جائے گا اس کو بروئے کار لاتے ہوئے اس تحقیق کو آگے بڑھایا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

ا۔ نزہت زیر گرونیری "محمد طفیل بحیثیت خاکہ نگار" مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۷ء

۲۔ بشریٰ ثمینہ ''اردو میں شخصیت نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (سرسید سے ۱۹۸۵ء تک)'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۲۰۰۰ء

۳۔ اردو لسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۰۵ء

۴۔ محمد عباس "خاکہ نگاری کا تحقیقی جائزہ" مقالہ برائے پی ایچ ڈی، قرطبہ یونیورسٹی پشاور، ۲۰۰۸ء

۵۔ عائشہ طلعت خلجی ''اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۲۰۱۲ء

۶۔ حامد محمود "محمد طفیل اور اے حمید کی خاکہ نگاری کا تقابلی جائزہ" مقالہ برائے ایم فل نمل اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

viii۔ تحدید

زیر نظر مقالے میں اردو میں خاکہ نگاری کی اصولی بحث اور مختصر جائزے کے بعد مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کی فکر اور فن کے تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے اس کے اشتراکات اور افتراقات کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا۔ سرسید تحریک کے بعد اردو میں غیر افسانوی نثر کی ترویج کا ایک نیا باب شروع ہوا جس میں سوانح نگاری کا فن اپنے عروج کو پہنچا اور اس کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے۔ یوں سوانحی ادب میں تنوع ہوا اور اس کی کئی ایک اقسام سامنے آتی گئیں جن میں خاکہ نگاری بھی سامنے آئی جس میں اختصار اور دلچسپی کا عنصر اہم قرار پایا۔

اردو میں خاکہ نگاری کے حوالے سے متعدد اہل الرائے اور صاحبِ طرز خاکہ نگاروں کی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی تحاریر مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں اور HEC کے منظور شدہ رسائل و جرائد میں بھی اس

حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہوتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ''خاکہ نگاری (فن اور تنقید) از ڈاکٹر بشیر سیفی۔ ''اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت'' از ڈاکٹر محمد عمر رضا اور اردو خاکہ نگاری (فن، تاریخ، تجزیہ)'' از شاہد حنائی میں بھی فن خاکہ نگاری کے اصول و ضوابط اور اہم خاکہ نگاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کتب میں ان تحقیقی و تنقیدی مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے جو خاکہ نگاری کی روایت اور فن کے حوالے سے اہم قرار پاتے ہیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

زیر نظر مقالے میں مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری و فنی سطح پر تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ تحقیق کی اہمیت کے نکات مندرجہ ذیل ہیں:

* مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں فکر اور فن کی نوعیت سامنے آئے گی۔
* مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کے اصولوں کی وضاحت ہو گی۔
* مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری میں فکر اور فن کے حوالے سے اشتراکات اور افتراقات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔
* ان دونوں کی خاکہ نگاری کے تقابلی جائزے سے جہاں اردو خاکہ نگاری میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین ہو سکے گا وہاں اردو میں خاکہ نگاری کے فن کے حوالے سے کچھ معیارات کا تعین بھی ہو سکے گا۔

ب: خاکہ نگاری اور دیگر اصناف نثر

خاکہ نگاری وہ صنف ادب ہے۔ جس میں شخصیات کے ظاہری اور باطنی اوصاف کو بیان کرتے ہوئے اچھائیوں اور برائیوں کو اس انداز سے سامنے لایا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے شخصیت کی ایک قلمی تصویر اُبھر کر سامنے آئے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اردو کے پرانے تذکروں میں ملتے ہیں۔ حسین آزاد کی "آب حیات" میں خاکہ نگاری کے کچھ عمدہ نمونے موجود ہیں۔ خاکہ نگاری میں افسانہ نگاری کا شائبہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں تاریخ اور تخیل دونوں کارفرما ہیں ۔ خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری یا مرقع نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کا اصل مدعا کسی شخصیت کا بیان ہے۔ شخصیت کو خاص شکل و صورت ،عادات واطوار، فکر، ذہن، اعمال و افعال اور صلاحیتیں قدرت کی طرف سے عطا کی جاتی ہیں۔ خاکہ نگار کا کام ان کو اصلی رنگ وروپ میں پیش کرنا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکی

تھی۔ خاکہ نگاری بھی اردو ادب کی ایک نئی صنف ہے جس کی ایجاد کا سہرا اردو کے لکھاریوں کے سر ہے۔ جوں جوں یہ صنف آگے بڑھی اس نے بھی اردو کی دوسری اصناف کی طرح انگریزی ادب کے اثرات قبول کیے۔ اردو میں اس صنف کے پہلے سے کوئی فنی اصول اور ضوابط متعین نہ تھے۔ مختلف ادیبوں نے اسے اپنے طور پر برتا اور اپنے سے قبل کے ادیبوں کے تجربات سے استفادہ کیا۔ یوں اس میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ جب اس صنف ادب میں تخلیقات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا تو نقادوں اور مورخین نے اس جانب توجہ کی۔ بعد ازاں اس کی فنی خصوصیات و لوازم کا تعین اور اس کی رفتار و ترقی کا جائزہ لیا گیا۔ خاکہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں ایک ہی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک خاکہ نگار سمندر کو کوزے میں بند کرتا ہے۔ یوں تو یہ ایک محاورہ یا مثال ہے لیکن اسی مثال کو خاکہ نگار عملی جامہ پہناتا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کو اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ شخصیت کا ہر پہلو تابندہ و روشن نظر آتا ہے۔ فن خاکہ نگاری میں شخصی تاثر کی بھی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ادب کے نقادوں کے خیال میں ایک سوانح نگار یا خاکہ نگار کو خود عظیم شخصیت کا مالک ہونا چاہیے تاکہ بڑی سے بڑی شخصیت کی مرقع کاری بہتر انداز میں کر سکے۔

خاکہ کو انگریزی میں سکیچ یا پین پورٹریٹ(Pen Portrait) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ "خاکہ" کے لغوی معنی کچا نقشہ یا ڈھانچہ کے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خاکہ ابتدائی خطوط ہیں جن پر مصنف اپنے قلم سے رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی عمارت تعمیر کرنی ہو یا کوئی مضمون لکھنا ہو اس کے لیے باقاعدہ خاکہ مرتب کیا جاتا ہے۔ اور پھر اسی خاکے کے خطوط پر بنیادیں اٹھائی جاتی ہیں اور عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ ادب کی اصطلاح میں خاکہ ایسی مختصر تحریر ہے جس میں شخصیت کا ناک نقشہ اس کے کردار کی چیدہ چیدہ باتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ باقی کام قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ مذکورہ شخصیت کی شکل و شباہت، سیرت اور عقائد و نظریات کی صحیح اور جامع تصویر مرتب کرے۔ حفیظ صدیقی خاکہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

> "خاکہ ایک سوانحی مضمون ہے جس میں شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اجاگر کیے جاتے ہیں۔ اور اس کی شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے"(۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

"خاکہ ایک پنسل سکیچ ہے۔ جس میں کم سے کم لائنوں سے چہرے کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو ابھارنے کے لیے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔"(۲)

ایک خاکہ نگار کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ جس شخصیت کو موضوع بنا رہا ہے۔اس شخصیت کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو سامنے رکھے کیونکہ انسان نہ تو نیکیوں کا مُرقع ہو سکتا ہے اور نہ ہی خامیوں کا مجموعہ۔ انسان میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی ایک خاکہ نگار کو اچھائیوں اور برائیوں میں توازن قائم رکھنا چاہیے۔خاکہ نگار اختصار کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے شخصیت کی ایسی تصویر قاری کے سامنے رکھتا ہے جو جامد نہیں بلکہ ایک متحرک تصویر ہوتی ہے ڈاکٹر عائشہ نے اپنے مقالے "اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ "میں خاکہ نگاری کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"خاکہ نگاری وہ صنف ہے جس میں شخصیت کی ایسی تصویر بنائی جاتی ہے۔ جسے قاری پڑھتا ہے تو ایسا لگتا ہے وہ پڑھ نہیں رہا بلکہ کوئی تصویر ہے جسے وہ حرکت و عمل کے ساتھ دیکھ رہا ہے، محسوس کر رہا ہے۔"(۳)

ایک خاکہ نگار کے لیے انسانی نفسیات پر عبور ہونا ضروری ہے۔خاکہ نگار کی زبان شگفتہ،سادہ،رواں ،بلیغ اور پہلودار ہو تا کہ وہ ایک بجے تلے انداز میں بات کر سکے۔اردو کے قدیم تذکروں میں کسی حد تک خاکہ نگاری کی کوشش کی گئی ہے بقول یحیی امجد:

"قدیم اردو تذکروں سے بجا طور پر خاکہ نگاری کی توقع کی جاسکتی تھی۔لیکن یہ توقع تذکروں سے پوری نہیں ہوتی۔کیونکہ ان میں شخصیت کا حال بیان کرنے سے زیادہ اس کے کلام کا زیادہ انتخاب کرنے پر توجہ دی گئی ہے۔شاعر کی ذات کے متعلق چند تعارفی یا تعریفی جملے ہیں۔یا اگر زیادہ اہم ہے تو اس کی زندگی کا ایک واقعہ ہے مگر ان تعارفی جملوں اور واقعات سے مجموعی طور پر کوئی تاثر قائم نہیں ہوتا۔"(۴)

یحیی امجد کے مطابق اردو کے قدیم تذکروں میں خاکوں کے آثار ملتے ہیں لیکن چونکہ ان تذکروں میں شخصیت کی بجائے ان کے کلام پر زیادہ توجہ ہوتی ہے اور شخصیت کے متعلق صرف تعارفی کلمات ہی ہوتے ہیں اس لیے ان تذکروں کو خاکہ نگاری کا عکس ہی کہا جاسکتا ہے۔راشد اشرف خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ (خاکہ) وہ تحریر ہے جس میں خاکہ نگار کسی انسان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ وہ شخصیت قاری کو ایک زندہ شکل میں نظر آئے۔ (۵)

شخصیت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں جو اس کی پہچان ہوتے ہیں۔ ایک خاکہ نگار اہم پہلوؤں کو جانچ پرکھ کے بعد ضابطہ تحریر میں لاتا ہے انور جمال نے خاکہ کی تعریف میں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ خاکہ اپنے اندر معروضی طرز رکھتا ہے۔ جس میں نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ شخصیت نکھر کر سامنے آجائے۔ پروفیسر صاحب نے مزاحیہ انداز کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے خاکہ نگاری کو یوں بیان کیا ہے:

"اس (خاکے) میں حقیقی مشاہدے کو شگفتہ اُسلوب میں پیش کیا جاتا ہے اور کردار کا بامعنی اور مثبت تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔۔ خاکے کا مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔"(۶)

خاکے کا اُسلوب شگفتہ ہونا چاہیے تاکہ صاحبِ خاکہ کے بارے میں ایک مضبوط تاثر اُبھرے۔ خاکے کا بنیادی مقصد بیان کردہ شخص کو توازن کے ساتھ پیش کرنا ہونا چاہیے۔ احمد ندیم قاسمی خاکہ نگاری کے بارے میں مندرجہ ذیل نقطہ نظر رکھتے ہیں:

"ہر ادیب کا اسلوب نگارش خاص اس کا اپنا ہے۔ مگر مقصد سبھی کا یہ ہوتا ہے کہ جس شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے، اس کے چہرے کے علاوہ اس کے مزاج کے خدوخال بھی واضح ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجائیں۔ (۷)

مذکورہ بالا تعریفوں کی روشنی میں خاکہ ایک مختصر مضمون ہے۔ خاکہ نگاری وہ صنفِ ادب ہے جس میں شخصیات کی تصاویر کچھ یوں کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے پوشیدہ اور ظاہری دونوں پہلو قاری کے سامنے آ جاتے ہیں اور ایسے لگتا ہے جیسے پڑھنے والے نے قلمی چہرہ دیکھا ہو اور شخصیت کو دیکھا بھالا ہو۔ خاکہ کی کوئی ایسی جامع تعریف کرنا ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام فنی اور ادبی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ البتہ اس کے بنیادی اصولوں اور خدوخال کی نشان دہی کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ خاکہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کا دیگر اصناف جیسے ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح عمری، انشائیہ، اور مکتوب نگاری وغیرہ سے گہرا تعلق ہے اس میں کسی شخصیت کی زندگی کے کارناموں، اس کی صورت اور سیرت کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ جس سے قاری

جمالیاتی حظ حاصل کرتا ہے۔ چونکہ خاکہ دیگر اصناف ادب سے مماثلت رکھتا ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ خاکے کو ان اصناف کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے۔ کن امور میں مماثلت ہے اور کہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

ناول اور خاکہ:

دیگر اصناف ادب کی طرح ناول بھی ایک مشہور صنفِ ادب ہے۔ اردو میں اس کی ابتداء ۱۸۶۷ء میں ہوئی۔ اس کی ابتداء کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے دور سے لے موجودہ دور تک جتنے ناول لکھے گئے ان میں خاکہ نگاری کے اثرات ملتے ہیں۔ ناول نگاری اور خاکہ نگاری میں کچھ مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر کے "ابن الوقت" عبدالحلیم شرر کے "فردوس بریں اور حسین آزاد کے "فسانہ عجائب" میں ایسے کردار موجود ہیں جن میں خاکہ نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ فردوسِ بریں میں "شریف زادہ" فسانہ عجائب میں "خوجی" کا کردار خاکہ نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح مرزا ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" پریم چند کا "گئودان" عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" راجندر سنگھ بیدی کا "ایک چادر میلی سی" سجاد ظہیر کا "لندن کی ایک رات" ایسے ناول ہیں جن میں خاکہ نگاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کس طرح اپنے ناول میں "امراؤ جان ادا" میں سراپا نگاری کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

> "خانم کی نوچیوں میں بیگا جان فرد تھیں۔ مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ، سیاہ جیسے الٹا توّا۔ اس پر چیچک کے داغ پاؤ قیمہ بھر دو تو سما جائے، لال لال آنکھیں، بھدّی ناک، بیچ سے پچکی ہوئی، موٹے موٹے ہونٹھ، بڑے بڑے دانت، فربا انتہا سے زیادہ اس پر ٹھگنا قد، بونی، ہتھنی کی لوگ کہتے تھے۔ مگر قیامت کا گلّا تھا"۔ (۸)

مرزا ہادی رسوا نے بیان کیے گئے اقتباس میں ایک خاکہ نگار کی طرح بیگا جان کا حلیہ بیان کیا ہے اور قاری کے دل و دماغ میں بیگا کا ایک عکس بٹھایا ہے۔ اس کے بعد "بنات النعش" کا یہ اقتباس بھی دیکھیے جس میں حسن آرا کی شخصی خرابیوں کا ذکر ہے۔ جو خاکہ نگاری کا اہم وصف ہے۔

> "حسن آرا بے چاری اس آفت میں مبتلا تھی کوئی خرابی نہ تھی کہ اس کے مزاج میں نہ ہو اور کوئی بگاڑ نہ تھا کہ اس کی عادات میں نہ ہو، بدزبانی، خود پسندی، بیباکی، جنگجوئی، حسد، دروغ گوئی، غیبت، بدلحاظی، تنگ چشمی، لالچ، بے صبری، سستی، بے ہنری، بد سلیقی۔" (۹)

ڈپٹی صاحب نے جس طرح ناول کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے وہ ایک ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایک خاکہ نگار بھی معلوم ہوتے ہیں۔ڈپٹی نذیر نے بطور ایک خاکہ نگار حسن آرا کی کرداری خرابیوں کو سپردِ قلم کیا ہے۔یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کوئی ناول نگار اپنے ناول میں کسی کردار کو بیان کرتا ہے تو وہ دراصل ناول نگاری کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری بھی کر رہا ہوتا ہے۔اس طرح ناول اور خاکہ میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور نظر آتی ہے۔

خاکہ اور افسانہ:

اگر اردو کی مقبول ترین اصناف کا ذکر ہو گا تو افسانہ کا ذکر ضرور ہو گا۔اس صنف کو ترقی و ترویج دینے میں منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر بیدی اور قراۃالعین کا بڑا ہاتھ ہے۔افسانے اور خاکے کا اگر جائزہ لیا جائے تو "اختصار" ان کی مشترکہ خوبی معلوم ہوتا ہے۔دونوں کو ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے۔لیکن پلاٹ کے حوالے سے خاکے اور افسانے میں بہت زیادہ فرق ہے۔خاکہ میں کسی شخص کی زندگی کے اہم واقعات کو اختصار سے بیان کیا جاتا ہے اور خاکے میں معروضیت ہوتی ہے۔جبکہ افسانہ نگار اپنی تخلیق کو موثر بنانے کے لیے تخیّل کا سہارا بھی لیتا ہے۔کرداری افسانوں میں شخصیت کے حلیے اور کردار کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی لیکن قاری بالکل مایوس بھی نہیں ہوتا۔پریم چند کے افسانے عید گاہ، کفن، پُوس کی رات، منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، کھول دو اور کرشن چندر کے افسانے کالو بھنگی وغیرہ میں خاکے کے کچھ عناصر ملتے ہیں۔منٹو کے مشہور افسانے "نیا قانون" میں منگو کوچوان کا جس طرح ناک نقشہ بیان ہوا ہے وہ خاکہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔دیکھیے:

> "منگو کوچوان اپنے اڈے کا عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر تھی اور اس نے کبھی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اس کو دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"(۱۰)

مذکورہ بالا افسانہ ایک کرداری افسانہ ہے جس میں سعادت حسن منٹو "منگو" کے کردار کی خوبیاں بالکل اس طرح بیان کرتا ہے جیسے کہ ایک خاکہ نگار اپنی ممدوح شخصیت کو بیان کرتا ہے۔اشفاق احمد کے افسانے "گڈریا" میں بھی خاکہ نگاری کی جھلک نظر آتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

"کبھی کبھار سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی ، ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ، کھدر کا تنگ پاجامہ اور فلیٹ بوٹ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا لڑکا ہوتا جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا"(۱۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں بھی اشفاق احمد نے اپنے افسانے کے مرکزی کردار کو ایک ماہر خاکہ نگار کی طرح بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ خاکہ نگار بھی موضوع خاکہ کی وضع قطع کو بالکل اسی طرح بیان کرتا جس طرح یہاں اشفاق احمد نے بیان کیا ہے۔

بیان کردہ اقتباسات سے یہ پتا چلتا ہے کہ افسانے میں شخصیت نگاری، ظاہری خدوخال کا ذکر دراصل خاکے کا ہی نقشہ ہے حالانکہ اس وقت اس صنف کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ خاکہ اور افسانہ مختلف اصناف ہونے کے باوجود آپس میں مشابہت رکھتے ہیں۔ خصوصاً کرداری افسانے اور خاکے میں بہت زیادہ مماثلت نظر آتی ہے افسانہ تفریحی ادب ہے اور خاکہ بھی افسانہ کی طرح مختصر ہلکی پھلکی اور تفریحی صنف ہی ہے۔

خاکہ اور ڈرامہ:

ڈرامہ اور خاکہ دونوں میں کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ ادبی ڈراموں کے تو پورے اقتباسات خاکہ نگاری معلوم ہوتے ہیں۔ ڈرامہ نگاری کی روایت ہندوستان میں کئی ہزار سال پرانی ہے۔ پہلے پہل سنسکرت زبان میں ڈرامے لکھے گئے۔ بیسویں صدی میں انار کلی جیسا مشہور و مقبول ڈرامہ منظر عام پر آیا۔ کردار ڈرامے کا اہم جزوّ ہے۔ دراصل کرداروں کی باہم بات چیت اور حرکات و سکنات کا نام ہی ڈرامہ ہے۔ ڈرامے میں کردار کی جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں ان کا اگر ان کو دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ڈرامہ نہیں بلکہ کوئی خاکہ ہے۔ مشہور ڈرامہ "انار کلی" کا ایک اقتباس دیکھیے:

"پندرہ سولہ سال کی نازک اندام لڑکی جس کے چمپئی رنگ میں آخری سرخی کی خفیف جھلک نہ تو شاید بیمار سمجھی جائے، خدوخال شعراء کے معیارِ حسن سے بہت مختلف، اس کا چہرہ دیکھ کے تخیّل پسندوں کو پھولوں کا ضرور خیال آتا ہے۔ لیکن مغلِ اعظم نے اسے جو خطاب دیا ہے اس کے متعلق کئی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ معانی سے

زیادہ الفاظ کے حسن و ترکیب کے باعث موزوں ہوا ہے۔ غم ناک آنکھوں میں جیسے
حسرتیں بیٹھی جھانک رہی ہیں یہی اس کی سب سے بڑی کشش ہے "(۱۲)

یہاں جس طرح انار کلی کے حسن کی تصویر کشی کی گئی ہے ایک خاکہ نگار بھی اپنے کردار کے خدوخال کو بالکل اسی انداز میں پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگار یہ کوشش کرتا ہے کہ جب وہ صاحبِ خاکہ کا حلیہ بیان کرے تو پڑھنے والے کے سامنے تصویر ابھر کر سامنے آجائے جس طرح مذکورہ بالا اقتباس میں انار کلی قاری کو سامنے بیٹھی معلوم ہوتی ہے۔ڈرامے کی یہی خوبی اس کو خاکے کے قریب لاتی ہے۔ڈرامے میں ہمیشہ کرداروں کو اُبھارا جاتا ہے۔ تاکہ دیکھنے اور پڑھنے والے کرداروں سے واقف ہو سکیں۔ ایک خاکہ میں بھی کردار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مختلف واقعات کو بیان کر کے خاکہ نگار اپنے کردار کو اُبھارتا ہے۔ڈرامے اور خاکے دونوں اصناف کا تعلق شخصیات سے ہے۔ڈرامے میں شخصیت کو سٹیج کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے اور اس کے ظاہر اور باطن کو اس کے مکالموں کے ذریعے دیکھنے اور پڑھنے والوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔جب کہ خاکہ نگار اپنی شخصیت کو قلم کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگار حلیہ بیان کرتا ہے۔ اور شخصیت کے ظاہر و باطن کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ڈرامے اور خاکے کے کرداروں میں مماثلت موجود ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ڈرامے میں بھی خاکہ نگاری کے نقوش موجود ہیں۔

خاکہ اور انشائیہ:

خاکہ اور انشائیہ بھی دو مختلف اصناف ادب ہیں لیکن دونوں کا قالب ایک ہی ہے۔ قالب کی یکسانیت کے ساتھ ساتھ بعض صنفی خصوصیات بھی ایک جیسی ہیں۔ خاکے اور انشائیہ کے موازنے سے قبل ہم انشائیہ کی ماہیت کو دیکھتے ہیں۔ اس صنف کی ابتداء فرانسیسی زبان میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور فرانسیسی ادیب Montaigne جو ادب کے پیشہ کو ترک کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو ہلکے پھلکے انداز میں لکھتا رہا۔ فرانسیسی ادب میں یہ بالکل نئی چیز تھی۔ اپنے ان مضامین کو اس نے Essai کا نام دیا۔ آگے چل کر یہ مستقل صنف ادب بن گئی۔ مختلف مصنفین اور نقادوں نے اس صنف کی حدود کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہڈسن کے مطابق انشائیہ ایسے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی مقصد کے باہم جوڑ دیے گئے ہوں۔ انشائیہ قصداً ایک سوچا سمجھا اور آسان لیکن مربوط اصولوں کی مدد سے

مناسب انداز میں اس شخص، چیز یا خیال کے متعلق ایک جائزہ ہوتا ہے جو انشائیہ نگار کو دلچسپ اور اہم معلوم ہوں۔ جمیل آذر انشائیہ یوں رقمطراز ہیں:

"انشائیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ جیسے ہی شروع ہوتا ہے قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی نے ستار کے تاروں پر مضراب رکھ دی ہے۔ ستار بجتا ہے اور سامع اس کی لہروں میں گم ہو جاتا ہے۔ پر کشش لہریں کانوں کے رستے دل اور دماغ پر چھا جاتی ہیں ۔ اور سامع ارضی پستیوں سے اٹھ کر سماوی بلندیوں پر پرواز کرنے لگتا ہے۔ ادھر ساز ختم ہوا، ادھر سامع واپس اپنے پیکر خاکی میں آ گیا۔"(۱۳)

اختصار اور جامعیت خاکے اور انشائیہ دونوں میں مشترک ہیں۔ دونوں کا انداز بیان شگفتہ، غیر رسمی اور بے تکلف ہوتا ہے۔ دونوں میں خیالات کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ انشائیہ کی طرح خاکہ میں بھی موضوع کے منتخب پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے۔ خاکہ تفصیلی معلومات نہیں دیتا بلکہ خاکہ اور انشائیہ دونوں انسان کی ذہنی اور تخلیقی کاوشیں ہیں ۔ جو تاثرات کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں ۔ڈاکٹر سلیم اختر انشائیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہیے۔ لطافت ایسی کہ انشائیہ مبتذل نہ ہو جائے اور شگفتگی ایسی کہ مزاح نہ ہونے کے باوجود بھی تحریر فرحت بخش ہو"(۱۴)

انشائیہ زندگی کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہے اور وہاں سے اپنے مطلب کے نقوش حاصل کر سکتا ہے لیکن خاکہ نگار اس قدر آزاد نہیں ہوتا کہ وہ کسی شخص کی نجی محفلوں یا تنہائیوں میں بھی جا سکے۔ انشائیہ نگار سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ اور کسی معمولی شے کو غیر معمولی بنا کر پیش کر سکتا ہے لیکن خاکہ نگاری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔۔ انشائیہ میں خاکہ نگاری کے اثرات ملتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اپنے انشائیہ مضمون "الوّ" میں جب الوّ کے اوصاف بیان کرتے ہیں تو خاکہ نگاری کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"الوّ کی زندگی کی بود و باش باخدا تارک الدنیا درویش کی سی ہے۔ وہ آدمی سے گھبراتا ہے۔ اس کو خلوت اور تنہائی بھاتی ہے۔ عام پرندوں کی طرح رونق دار شہروں اور غل و شور کے مقام پر آشیانہ نہیں بناتا، سرسبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر نغمہ سنجی نہیں کرتا جس سے فرحت پسند انسان جی بہلائے۔ الوّ سارا دن حریص پرندوں کی

مثل پیٹ کی خاطر در بدر مارا مارا نہیں پھرتا بلکہ وہ اجاڑ اور کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے"(۱۵)

"حسن عسکری کی یاد میں" میں ایک انشائیہ مضمون تحریر کیا گیا جس میں حسن عسکری کی سراپا نگاری بالکل خاکے کی مانند کی گئی دیکھیے:

"دراز قد اور بے ڈول جسم کی ان کی شخصیت کئی اور شخصیتوں پر بھاری تھی۔ کسی بھی نئے شخص کو ان تک پہنچنے کے لیے سوچنا پڑتا تھا لیکن جب کوئی طالب علم ان کے دوبدو ہو کر انھیں سلام کر لیتا تو وہ ان کی شفقت بھری مسکراہٹ کا ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتا۔ دوسری بار کلاس سے باہر اس طالب علم پر عسکری صاحب کی کی نظر پڑ جاتی تو وہ اس کا نام لے کر بلاتے، کبھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتے، طویل قامت ہونے کی وجہ سے ان کا ہاتھ بڑی آسانی سے طالب علم کے کاندھے تک پہنچ جاتا"(۱۶)

بیان کیے گئے اقتباسات میں خاکہ نگاری کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ حسن عسکری کی شخصیت اور عادات کا بھرپور طرح جائزہ لیا گیا ہے جب کہ خواجہ حسن نظامی نے بھی الوّ کی طرز بود و باش کا خوب نقشہ کھنچا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خاکے کی ابتدائی نشوونما انشائیے کے زیر اثر نہیں ہوئی۔ خاکے کے ابتدائی نقوش داستان، افسانے، ناول، سوانح عمری اور تذکروں میں ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ خاکہ نگاری کے لیے انشائیہ کا سانچہ اپنایا گیا۔ سانچہ اختیار کرنے کی بدولت اس صنف کی چند اہم خصوصیات خاکے نے اختیار کر لیں۔ لیکن خاکہ نگاروں نے خاکہ نگاری کو جداگانہ طور پر پروان چڑھایا اور اس فن کو اتنی ترقی دی کہ اب وہ ایک مستقل صنف ادب بن چکا ہے۔ اس کو انشائیے کی قسم قرار دینا اب درست نہیں ہو گا۔

خاکہ اور سوانح عمری

خاکہ اور سوانح عمری دو مختلف اصناف ہیں۔ لیکن موضوع کے اعتبار سے سوانح اور خاکہ میں کچھ مماثلت نظر آتی ہے۔ سوانح ادب کی ایسی صنف ہے جس میں افراد کی زندگیوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ اس حیثیت سے سوانح عمری کی حیثیت دوہری ہے۔ ایک تاریخی دوسری ادبی، تاریخی حیثیت میں فرد کی زندگی کے سچے واقعات کی روداد ہونی چاہیے۔ ادبی حیثیت سے سوانح عمری اپنے اسلوب اور سانچے کے ذریعے جمالیاتی ذوق کو تسکین پہنچائے۔ سوانح کی اصطلاح بہت وسیع ہے۔ خدا کے پیغمبر، اللہ کے ولی، آئمہ کرام

،ادیب اور شاعر بہادر سپہ سالار غرضیکہ کوئی بھی انسان سوانح نگاری کاموضوع بن سکتاہے۔ حفیظ صدیقی سوانح عمری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عصر، نسل اور ماحول جیسے موثرات کے حوالے سے کسی شخص کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کا ایسا جامع، مفصل اور معروضی مطالعہ، جو اس کی زندگی کے ارتقاءاور اس کے ظاہر اور باطن کو روشنی میں لا کر اس کی ایک ایسی قد آدم اور جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے جس پر کسی اور کی تصویر ہونے کا مطلق گمان نہ گزرے۔"(۱۷)

سوانح نگاری کا فن ایک مشکل پہاڑی سفر کی مانند ہے۔ کسی شخصیت کی سوانح لکھنا تو آسان ہے لیکن شخصیت کے ساتھ انصاف کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ سوانح عمری میں حقائق کے بیان کے ساتھ دلچسپی کو بھی برقرار رکھا جاتا ہے۔ سوانح نگار کو اپنی موضوع شخصیت اوراس کے کارناموں کو واضح انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ خاکہ ایسی کسی وضاحت کا متحمل نہیں ہوتا۔ سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو بحیثیت انسان پیش کرے اس کی شخصیت کے تمام پہلو نہ صرف واضح ہوں بلکہ اس کا ہیرو ایک جیتا جاگتا انسان معلوم ہو۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ ایسی تصویر پیش کرے جس میں ایک واقعہ سے بھی کسی شخصیت اور اس کی زندگی کا پورا نقش واضح ہو جائے۔ اول الذکر تخلیقی صورت سوانح کہلائے گی اور مواخر الذکر شخصی خاکہ۔ اردو ادب میں باقاعدہ سوانح عمریاں شاعروں اور ادیبوں ہی کی لکھی گئی ہیں۔ اردو کے سوانحی ادب میں حالی نے پہلی بار واضح اور مکمل تصاویر پیش کیں۔ ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

"باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے۔ ان کے بعد شبلی کا نمبر آتا ہے۔ یہ دونوں مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی سوانحی تصانیف اردو ادب کا ایک دقیع حصہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سربلندی کا باعث ہیں۔"(۱۸)

متذکرہ بالا امور کے پیش نظر اگر سوانحی عمری اور خاکے کا موازنہ کریں تو دونوں میں یہ فرق نظر آتا ہے کہ سوانح نگار کسی شخصیت کی پیدائش تعلیم وتربیت تمام اہم اور غیر اہم واقعات کو اپنی تحریر کے ذریعے اس طرح قید کرتا ہے کہ فرد کی زندگی ایک آئینہ بن کر سامنے آسکے۔ خاکہ نگار حقائق کی بجائے واقعات کو ترتیب کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک فرد آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتا ہے۔ خاکہ نگار سوانح عمری

سے زاید حصے کو الگ کرتا ہے تاکہ ایک دل کش روپ ہمارے سامنے آجائے۔ خاکہ نگاری میں شخصیت کو تخئیل اور مبالغہ آرائی سے ہٹ کر اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سوانح نگاری کا آغاز ۱۸۶۱۔ ۶۲ میں ہو الیکن پھر بھی اس صنف میں خاکہ نگاری کے کچھ نہ کچھ نقوش مل جاتے ہے۔ یادگار حالی کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"۱۸۳۶ء ۱۲۵۳ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام الطاف رکھا گیا۔ اس لڑکے کو آج دنیا حالی کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی والدہ سیدّانی تھیں۔ اور والد کا شجرہ نسب حضرت ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے عالم دین ،صوفی اور ادیب و خطیب گزرے ہیں۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جیّد قاری حافظ ممتاز کے پاس قرآن کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ فارسی کے ساتھ انھیں عربی کا شوق بھی پیدا ہوا" (۱۹)

"انھیں طلب علم کی دھن میں آرام و آسائش کی ذرا پروانہ تھی۔ تکیہ نہ ہوتا تو سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے، کھانے کو نہ ملتا تو بھوکے سو رہے، روح کی بھوک اور دل کی پیاس بجھانے میں اس طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا۔"(۲۰)

"حالی اس وقت کے نوجوان تھے۔ مگر تجربہ ، متانت، اور زمنہ شناسی بوڑھوں جیسی تھی۔ دل ایسا دردمند کہ چیونٹی کی تکلیف پر بھی دکھ جاتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد نہ کرتے"(۲۱)

اوپر بیان کیے گئے اقتباس حالی کی شخصیت کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں وہ دراصل حالی کی شخصیت کے مختصر خاکے ہیں۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سوانح عمری میں جب شخصیت کے خدوخال بیان ہوتے ہے تو خاکے اور سوانح عمری میں تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تعلق کی مزید وضاحت "یادگار غالب" سے بھی ہوتی ہے دیکھیے:

"میرزا اسداللہ خان غالب المعروف میرزا نوشہ ، المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک اسداللہ خان بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ فارسی و اسد در ریختہ ، شب ہشتم ماہ رجب سنہ ۱۲۱۲ ہجری کو آگرہ شہر میں پیدا ہوئے"(۲۲)

"عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوشرو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی۔ جب کہ راقم نے پہلی ہی بار ان کو دیکھا ہے۔ جسامت اور

خوبصورتی کے آثاران کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے لیکن چونکہ ہاڑ چکلا قد کشیدہ اور ہات پاؤں زبر دست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نووارو توران معلوم ہوتے تھے۔"(۲۳)

درج بالا اقتباسات میں غالب کی سوانح عمری میں میں ان کی پیدائش قد و قامت اور حلیہ کا بیان ہے۔ حالؔی نے خاکہ نگار کی مانند غالب کی شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے اور لاشعوری طور پر وہ ہمیں ایک خاکہ نگار نظر آتے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوانح عمری میں خاکہ نگاری کے نقوش موجود ہیں۔

خاکہ اور مکتوب نگاری:

خاکہ اور مکتوب نگاری دونوں میں شخصیات کا ذکر ہوتا ہے۔ شخصی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ مکتوب نگاری انفرادیت یہ ہے کہ اس لکھنے والے کے سامنے قارئین کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک قاری ہوتا ہے۔ اردو کے پہلے مکتوب نگار مرزا اسد اللہ خان غالب ہیں۔ آپ نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو خطوط لکھے۔ غالؔب کے خطوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرزا غالب خط نہیں لکھ رہے بلکہ کوئی خاکہ لکھ رہے ہیں۔ مرزا غالب خطوط میں زندگی کے حالات بیان کرتے ہیں۔ زندگی کے حالات کا بیان خاکہ کی خوبی ہے۔ کئی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے بھی ایسے خطوط ملتے ہیں جن میں خاکہ نگاری کی صورت نظر آتی ہے۔ خطوط نگاری میں مرزا غالب کا طرز بیان منفرد نوعیت کا ہے۔ غالب کی مکتوب نگاری کے بعد مکتوب نگاری کا نہ رکنے والا سلسلہ چل نکلا۔ خطوط نجی تحریریں ہوتی ہیں۔ خطوط مکتوب نگار کی زندگی اور شخصیت کے چھپے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ اس کی عادات و اطوار، خیالات جذبات اور افکار و نظریات کا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ خطوط شخصیات کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خطوط اور خاکہ نگاری کا آپس میں ربط ہے۔ خطوط میں خاکہ کے عناصر ملتے ہیں۔

غالب کے علاوہ اقبال، شبلی، اکبر الہٰ آبادی اور ابوالکلام آزاد نے بھی خطوط لکھے۔ یہ خطوط ان کی شخصی زندگیوں کو بہت حد تک نمایاں کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے ظہیر احمد صدیقی کے نام ایک خط لکھا جس میں ان کے والد محترم کی وفات پر تعزیت کی ہے۔ اس خط میں رشید احمد صدیقی نے ان کے والد محترم کی شخصی خوبیوں کو اس بالکل اس طرح بیان کیا ہے جیسے وہ کوئی خاکہ نگار ہوں ملاحظہ فرمائیں:

"میرا خیال ہے کہ مرحوم سے شاید ہی کبھی کسی کو تکلیف پہنچی ہو، شریف شخص کی یہ صفت سب سے معتبر مانی گئی ہے، اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر مرحوم کی نظر بڑی گہری، وسیع، متنوع تھی۔ جس کے ہم سب معترف رہے اور اس سے استفادہ کیا۔ ناملائم الفاظ کبھی زبان پر نہ لائے، بڑے شوق اور سنجیدگی سے علمی مسائل پر اظہار خیال فرماتے"(۲۴)

اسی طرح رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط بنام پروفیسر بشیر الدین میں علی گڑھ کی جو منظر کشی کی ہے وہ بھی دراصل خاکہ نگاری ہے۔ خط میں خاکہ کی کیفیت نمایاں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"موجودہ صدی کی ابتداء میں تقریباً ۳۰، ۴۰ سال تک ہر متوسط مسلمان گھرانے کا یہی نقشہ رہا ہے ان خاندانوں کی کچھ مشترک خصوصیات و روایات اور رجحانات تھے جن کا سرچشمہ مذہب، اخلاق، تاریخ اور تہذیب تھی جن کی پیروی اطراف و جوانب میں میں دور دور تک کی جاتی تھی۔ کسی نہ کسی حد تک اب بھی کی جاتی ہے اس کے بھلے اور برے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں ان خصوصیات کے نمونے اور نمائندے ہر مشترک خاندان کے افراد میں کچھ دن پہلے مل جاتے تھے ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر یا مشترک مکتبوں (بالعموم مساجد) میں ہوتی تھیں مزید مطالعے کا کام گھر کے مختصر کتب خانے سے لیا جاتا، جن میں مذہبی، اخلاقی اور تفریحی کتابیں ہوتیں گھر کی یا گھریلو کتابیں اور عزیزوں اور بزرگوں کے شریفانہ طور طریقے اور ان کی دی ہوئی روایات ہوتیں جو ابتدائی عمر کی ہمارے تخیّل (Imgination) کو گرمی اور جولانی بخشیں، اس تخیل لیے ہوئے ہم یا یہ تخیل ہم کو لیے ہوئے علی گڑھ میں داخل ہوئے یہاں سے وہ کرشمہ انقلاب یا قلب ماہیت شروع ہوتی ہے جس کا دوسرا نام علی گڑھ ہے"(۲۵)

مذکورہ بالا اقتباسات میں رشید احمد نے لاشعوری طور پر خاکہ نگاری کی ہے حالانکہ اس وقت اردو ادب میں خاکہ نگاری کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اب جب کہ خاکہ نگاری نے ایک باقاعدہ صنف کی شکل اختیار کرلی ہے تو ہم مکتوب نگاری میں آسانی سے خاکہ نگاری کو تلاش کرسکتے ہیں۔ مکتوب نگار خطوط میں گھریلو مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ سماج اور معاش، شادی بیاہ، موت، بیماری پُرسی کی باتوں کو خطوط میں شامل کرتے

ہیں ایک خاکہ بھی درج بالا عناصر لیے ہوئے ہوتا ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ مکاتیب میں خاکہ نگاری کو تلاش کرتے ہوئے ہمیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

فن خاکہ نگاری

انسان کو اللہ تعالٰی نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس کو عقل و شعور عطا ہوا ہے۔ اسی عقل و شعور کی بدولت انسان اپنے جذبات احساسات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ جذبات احساسات کی ترجمانی کے لیے انسان نے لفظوں کا سہارا لیا، زبان کو استعمال میں لایا اور یوں اپنے تخیّل کو کام میں لا کر اظہار و بیان کرنے لگا۔ یہ لفظ اور زبان زندگی کو متاثر کرنے لگے۔ انہی لفظوں سے تحریری سرمایہ بنا اور پھر یہی تحریری سرمایہ "ادب" کہلایا۔ بعد ازاں اس تحریری سرمایہ کی جانچ پڑتال ہوئی تو اس بات کا تعین کیا گیا کہ سارے کا سارا تحریری سرمایہ ادب نہیں ہے۔ ادب کی خصوصیات کا تعین کیا گیا اور صرف ایسی تحریروں کو ادب مانا گیا جن میں مصنف کے اسلوب کا اظہار، انسانی دلچسپی، مصنف کا تخیّل، حسن آفرینی وغیرہ جیسے عناصر موجود ہوں آگے چل کر یہی تحریری سرمایہ دو اقسام میں بٹ جاتا ہے۔

۱۔ منثور تحریری سرمایہ

۲۔ منظوم تحریری سرمایہ

منثور تحریری سرمایہ کو ہم نثری ادب بھی کہتے ہیں۔ نثری تحریری سرمایہ میں صاف اور سادہ زبان استعمال ہوتی ہے۔ اس کے معانی آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے بے تکلف اور سیدھا سادا قدرتی ذریعہ نثر ہی ہے۔ البتہ نثر میں قواعد کی پابندی کی جاتی ہے۔ نثر بہترین الفاظ کا تقاضا کرتی ہے۔ نثر عام تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہوتی ہے۔ فلسفہ، مذہب، سائنس اور جغرافیہ کے لیے جتنی بھی کتب لکھی گئیں وہ سب کی سب اسی نثری سرمائے کا حصّہ ہے۔ نثر آگے چل کر مزید دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

افسانوی نثر

غیر افسانوی نثر

افسانوی نثر میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں جبکہ غیر افسانوی نثر میں مضمون، انشائیہ، خاکہ، رپورتاژ، سفر نامہ وغیرہ آتے ہیں۔

تحریر افسانوی ہو یا غیر افسانوی یہ مصنف کے تجربات، تاثرات، جذبات اور خیالات کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر نثری تحریر مخصوص شکل اور اوصاف کی حامل ہوتی ہے۔ دراصل ادب کی تمام اصناف کا مقصد زندگی کی تصویر کشی ہے انسان ادب کا موضوع ہے۔ اگر انسان کو ادب سے نکال دیا جائے تو شاید ادب کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔ ادب میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مخاطب انسان ہی تھا اور ہے۔ جو تحریریں جانوروں پر لکھی گئیں ان کا مقصد بھی انسان ہی کو کوئی سبق دینا اور راہ دکھانا تھا۔ انسانیت کے لکھنا ادب کی ایک صورت ہے جبکہ انسان کے بارے میں لکھنا ایک دوسری صورت۔ انسانیت کی لیے بہت کچھ لکھا گیا۔ تمام نثری ادب اس سے بھرا پڑا ہے جبکہ انسان پر لکھنے کی ابتداء ذرا دیر سے ہوئی۔ جب انسان کی خوبیوں، خامیوں، نظریات، حلیہ، وضع، قطع اور رہن سہن کو موضوع بنایا گیا تو ادب کی ایک نئی صنف 'خاکہ نگاری' کی ابتداء ہوئی۔ جب یہ نئی صنف ظہور پذیر ہوئی تو اس کی شکل زیادہ واضح نہ تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس میں نکھار آتا گیا اس کے اصول و قواعد بنتے گے اور پھر کئی سالوں کے بعد اس صنف 'خاکہ نگاری' نے ایک منظم شکل اختیار کر لی ۔اب خاکہ نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم اور مشہور صنف ہے۔ شروع شروع میں خاکہ نگاری کو سوانح کی ایک شاخ سمجھا گیا لیکن بعد میں اس کی ایک مخصوص صورت سامنے آگئی۔ یہ صنف زیادہ پرانی نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کو دوسری اصناف سے علیحدہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور یہ امر ضروری بھی ہے کہ اس کے اصول وضوابط کو واضح کیا جائے تاکہ اس کو مجوزہ اصول وضوابط کے ساتھ ہی برتا جائے۔

خاکہ نگاری کی ابتداء بیسویں صدی کی دوسری، تیسری دہائی میں ہوئی۔ فارسی اور اردو کے قدیم تذکروں میں خاکہ نگاری کی کچھ صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس طرح دوسری اصناف میں بھی خاکہ نگاری کے عناصر ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں بھی نقادوں نے خاکہ نگاری کے عناصر کا پتہ چلایا ہے لیکن دوسری اصناف میں پائے جانے والے نمونے خاکہ نگاری کے نقوش تو کہلا سکتے ہیں خاکہ نگاری نہیں۔ اردو خاکے کی ابتداء کے بارے میں محققین اس بات پر متفق ہیں کہ پہلا خاکہ مرزا فرحت بیگ نے "مولوی نذیر کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھا مرزا فرحت بیگ کے "خاکہ" سے خاکہ نگاری کا سفر شروع ہوا۔ بعد میں مولوی عبد الحق اور رشید احمد صدیقی نے اس کو آگے بڑھایا۔ خاکہ نگاری بھی دوسری اصناف ادب کی طرح انگریزی سے ہی اردو ادب میں آئی۔ اس لیے سب سے پہلے اس کی انگریزی تعریف کو دیکھتے ہیں:

"Sketch" is a piece of writing that is generally shorter than a short story,and contains very little[26]

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اردو ادب کے ناقدین اور محققین نے خاکہ نگاری کی حتمی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی۔ یحیی امجد نے اپنی کتاب 'فن اور فیصلہ' میں لکھا:

"خاکے میں تو کسی شخصیت کو جیسی وہ ہوتی ہے، من و عن ویسا ہی پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے اچھا یا برا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی کے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے ان کی ترتیب کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آتی ہے"(۲۷)

یحیی امجد نے خاکے میں شخصیت کے بیان کے حوالے سے جو خاص بات کی ہے وہ یہ ہے کہ شخصیت کی زندگی کے واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے فن کا بھی ذکر کیا کہ فنی مہارت کا بھی خیال رکھا جائے۔ خاکے کے فن کے حولے سے اگر بات کی جائے تو یقیناً ہمیں ان فنی خصوصیات کا جائزہ لینا ہو گا جن کا ایک خاکہ میں ہونا ضروری ہے۔ خاکہ نگاری میں کم الفاظ سے کسی بھی شخصیت کے اوصاف کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'اختصار خاکہ کی بنیادی خوبی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت میں رقمطراز ہیں:

"انگریزی sketch کے لیے مستعمل اصطلاح خاکہ اس مختصر تحریر کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی فرد کے بارے میں شخصی تعلقات، نجی کوائف اور ذاتی احوال پر مبنی ہو۔ اسے شخصیت نگاری کی مختصر ترین صورت بھی کہا جاسکتا ہے، اگر سوانح عمری ناول ہے تو پھر خاکہ کو مختصر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر پینٹنگ کی اصطلاح میں بات کریں تو خاکہ " Miniature " کے مماثل نظر آتا ہے"(۲۸)

سلیم اختر نے بھی خاکہ نگاری کو شخصیت کا مختصر بیان قرار دیا ہے۔ یعنی خاکے کا اختصار ہی خاکہ کی سب سے بنیادی اور بڑی خوبی ہے۔ ایک خاکہ نگار موضوع خاکہ کی نمایاں اور مسلم خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے شخصیت کے افکار و نظریات قاری کے سامنے عیاں کرے۔ اس ضمن میں جن واقعات کا انتخاب کرے وہ خلوت و جلوت کے صحیح عکاس ہوں۔ خاکہ نگار اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر تمام مواد کو اس طرح ترتیب دے کہ شخصیت کے منفرد پہلو روشن ہو سکیں۔ ڈاکٹر گلنار بانو نے خاکے کو کچھ اس انداز سے دیکھتی ہیں:

"خاکہ دراصل ایک شخصی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم، نمایاں اور منفرد پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے کہ وہ شخصیت ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی متحرک صورت میں قاری کے سامنے آجائے"(۲۹)

ڈاکٹر گلنار نے بھی عملی صورت کو خاکہ نگاری قرار دیا ہے۔ خاکہ دراصل ایک شخص میں پائے جانے والے تمام اوصاف ورذائل کا بیان ہے۔ خاکے میں نہ تو صرف تعریف کے پُل باندھے جاتے ہیں اور نہ ہی موضوع خاکہ کی خامیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگار جن جن اوصاف کا مشاہدہ کرتا ہے ان کو بیان کرتا ہے۔ اس بیان میں خاکہ نگار مکمل غیر جانب دار رہتا ہے۔ کبھی کبھار خاکہ نگار کو موضوع خاکہ کے حوالے سے ہمدردی والا روّیہ بھی اختیار کرتا ہے اور شخصیت کی شخصی خامیوں کو اس کے حالات و واقعات کے تناظر میں دیکھتا ابیان کرتا ہے تاکہ شخصیت سے وحشت نہ پیدا ہو بلکہ محبت کا جذبہ برقرار رہے۔ محمد طفیل خاکہ نگاری یوں بیان کرتے ہیں ں:

"صرف عیب جوئی خاکہ نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوف خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے۔"(۳۰)

حلیہ نگاری بھی اس کا خاکہ کا اہم جزو ہے۔ دور جدید میں کچھ خاکہ نگاروں نے حلیہ نگاری سے پہلو تہی کی ہے اور خاکوں زیادہ زور کردار نگاری پر لگایا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حلیہ کسی کے کردار کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کرتا معصوم بھولی بھالی صورتیں بھی نفرت انگیز سیرت کی مالک ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر عمر رضا خاکہ میں حلیہ نگاری کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"خاکہ دراصل انگریزی لفظ sketch کے مترادف ہے جس کے معانی کچا نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ نثری تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادھے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔"(۳۱)

بشیر سیفی نے بھی حلیہ کو اہم قرار دیتے ہیں۔ آپ کے مطابق جب تک حلیہ قاری کے سامنے نہیں رکھا جاتا قاری موضوع خاکہ سے متعارف ہی نہیں ہو سکتا وہ فرماتے ہیں:

"جب تک خاکہ نگار شخصیت کا ظاہری عکس یا حلیہ اور وضع قطع پیش نہیں کرتا قاری اس سے متعارف نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا تصور ذہن قبول نہیں کرتا"(۳۲)

ایک چلتے پھرتی شخصیت کے لاتعداد پہلو ہوتے ہیں۔ یہ بے شمار پہلو ہی اس شخصیت کی پہچان ہوتے ہیں۔ خاکہ نگار کا کام ہے کہ ان پہلوؤں کا عمیق مطالعہ کرے اور انھیں ضبط تحریر میں لائے۔ خاکہ میں حلیہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور کردار کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے پیکر تراشی بھی کی جاتی ہے۔ ان تمام امور کا بیان تب ہی دلچسپ ہو گا جب خاکہ نگار کو زبان پر قدرت ہو گی۔ ساتھ ہی خاکہ نگار کی قوت مشاہدہ کا گہرا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ قوت مشاہدہ کی گہرائی کی بدولت ہی وہ شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو سامنے لا سکے گا ڈاکٹر غفور شاہ اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"خاکہ نگاری حلیہ نگاری بھی ہے، چہرہ نمائی بھی، پیکر تراشی بھی ہے اور کردار نویسی بھی۔ یہ شیشہ سازی کا فن ہے ۔۔۔۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ صاحب خاکہ کی شخصی گہرائی میں اتر کر خوبیوں اور خامیوں کے موتی اور حذف ریز نکال لانے کا ہنر جانتا ہو"(۳۳)

خاکے کے اندر معروضیت کا ہونا بھی لازم ہے۔ خاکہ میں شخصیت کے بہت ہی اہم زیرِ بحث آتے ہیں۔ تمام حقائق پوری دیانت داری سے بیان کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگار موضوع خاکہ کو اس کی خوبیوں، خامیوں، دوستیوں، دشمنیوں، محبتوں، نفرتوں کو اپنے تبصرے اور تجزیے کے بغیر پیش کرتا ہے۔ اس طرح ہی موضوع خاکہ کی مکمل تصویر کشی ممکن ہے۔ پروفیسر شمیم 'آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ' میں اس جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"خاکہ نگار محتسب نہیں ہوتا اسے یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے موضوع پر حکم لگائے یا فیصلے صادر کرے۔ اسے افسانہ نگار کی طرح اپنے موضوع کی طرف خاصا رواداری کا رویّہ اپنانا پڑتا ہے تاکہ اس کی بنائی ہوئی تصویر کسی ترمیم اور اضافے کے بغیر جیسی ہے اس شکل میں سامنے آئے۔"(۳۴)

خاکہ نگاری کی صنف بظاہر سادہ اور آسان نظر آتی ہے مگر در حقیقت یہ ایک مشکل صنف ہے۔ اس میں اشاروں میں بات کرتے ہوئے موضوع خاکہ کو پوری آب و تاب سے قاری کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر خلیق انجم نے خاکے کے فن کو مشکل کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خاکے کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے اسے اگر نثر میں غزل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا جس طرح غزل میں طویل مطالب (دو مصروں میں) بیان کرنے پڑتے ہیں ٹھیک اس طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔"(۳۵)

خاکے کا ایک اور بہت ہی اہم عنصر اس کا اسلوب ہے۔ خاکے میں دلچسپی اور دل کشی اس کے شگفتہ اسلوب کی وجہ سے آتی ہے۔ اگر خاکہ میں شائستگی ہو اور خاکہ نگار مردم شناس ہونے کے ساتھ انسانی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہو اور اپنی بات کو مختصر شگفتہ اسلوب میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو ایک شاہکار خاکہ تخلیق پاتا ہے۔ خاکہ میں صرف اور صرف سچائی کو بیان کیا جاتا ہے اس لیے خاکہ نگار کو چاہیے کہ وہ کڑوی کسیلی باتوں کو اپنے دل کش اسلوب سے قابل قبول بنائے۔ اسلوب جتنا واضح، دل کش، آسان اور بے تکلف ہو اتنا ہی ادیب کی سنجیدگی اور وقار کو ظاہر کرے گا۔ خاکہ نگار کو محتاط انداز میں موضوع خاکہ کے معائب اور محاسن پر قلم اٹھانا چاہیے۔ غیر اہم معلومات کی گنجائش خاکہ میں نہیں ہوتی۔ خاکہ نگار واقعات کی کی مدد سے موضوع خاکہ کے معائب اور محاسن پکڑتا ہے اور اپنے شگفتہ اسلوب کو استعمال میں لاتے ہوئے قاری کے سامنے ایک متحرک تصویر پیش کرتا ہے۔ شخصیت کے بیان کے لیے اسلوب نگارش کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس ضمن میں علیم الدین اس نقطہ نظر کے قائل نظر آتے ہیں کہ جیسی شخصیت ہو اس کے مطابق ہی اسلوب اختیار کیا جائے۔ مزاحیہ شخصیت کے لیے اسلوب بھی مزاحیہ ہونا چاہیے اور متوازن شخصیت کے لیے اُسلوب بھی متوازن ہی ہو۔ تشبیہات و استعارات کو استعمال بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلوب کے لیے تحریر کا انداز۔ زبان و بیان اور لب و لہجہ کی اصطلاحیں استعمال ہوتی رہی ہیں دراصل اسلوب ہی ادب کی پہچان ہے۔

اُسلوب سے بیان کردہ شخصیت میں جان ڈال کر اس کو متحرک دکھایا جا سکتا ہے۔ خاکے میں واضح تاثر کو اُبھارنے کے لیے واقعات اہم ہیں لیکن اگر اُسلوب شگفتہ اور شائستہ ہو گا تو قاری کے سامنے ایک متحرک اور زندہ جاوید صورت پیش ہو گی۔

خاکہ نگاری میں جہاں اختصار، وحدتِ تاثر، کردار نگاری، منظر نگاری اور اُسلوب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے وہاں یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ موضوعِ خاکہ کی شخصیت کے حوالے سے دستیاب مواد کو کس ترتیب و تنظیم کے ساتھ قاری کے سامنے لایا جائے تاکہ قاری شخصیت کے بارے میں اچھا تاثر قائم کر سکے۔ اس سلسلے میں کچھ تکنیکی حدود کا متعین کی گئی ہیں۔ تکنیک دراصل وہ ڈھنگ ہے جس کے ذریعے سے کوئی بھی تخلیق کار اپنے تخلیق منظرِ عام پر لاتا ہے

ایک خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا انتخاب کرے گا تو وہ موضوع خاکہ کے بارے میں معلومات اکٹھا کرے گا۔ واقعات جمع کرے گا۔ اس کی زندگی کے متعلق ں جو کچھ جانتا ہے یا اس کے احباب سے جو معلومات ملیں گی سارے مواد کو اکٹھا کرنے کے بعد ایک نظم اور ترتیب سے ان کو ضبط تحریر میں لائے گا۔ یہی طریقہ کار اس کی تکنیک کہلائے گا۔ خاکہ نگاروں نے مختلف تکنیکس کی مدد سے خاکے لکھے ہیں۔ منٹو نے افسانوی رنگ میں خاکے لکھے ہیں۔ محمد طفیل کا منٹو پر لکھے ہوئے خاکہ میں مکتوب نگاری کی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ دراصل جو خاکہ نگار دوسری اصناف میں طبع آزمائی کر رہا ہوتا ہے وہ اس صنف کے کچھ نہ کچھ اثرات خاکہ نگاری میں لاشعوری طور پر داخل کر دیتا ہے منٹو کے علاوہ عصمت چغتائی کے ہاں بھی افسانے کی تکنیک ملتی ہے۔

خاکوں کا اہم جزو مواد بھی ہے۔ دیگر اصناف ادب میں مواد کے حوالے سے بحث نہیں کی جاتی لیکن خاکہ نگاری میں مواد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ شخصیت کے اظہار کے لیے اس کی زندگی کے واقعات اور اس کے نظریات اہم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ تمام واقعات و نظریات کو خاکہ میں شامل کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس سے خاکے میں دلچسپی کا عنصر متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے خاکہ نگار موضوع خاکہ کے حوالے سے واقعات کے انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے کہ کوئی غیر ضروری واقعہ خاکے کا حصہ نہ بن جائے اسی طرح ضروری واقعہ جو شخصیت کے اظہار کے لیے اہم ہے رہ نہ جائے۔ خاکہ نگاری میں ہمیں مواد اور اس کی پیش کش کے درمیان گہرا ربط نظر آتا ہے اس ربط کو ڈاکٹر انور جمال یوں دیکھتے ہیں:

> " خاکہ نگار "زیرِ بحث" شخصیت کی زندگی، اسلوب حیات، عادات و خصائل اور اس کی روز مرّہ زندگی سے ایسے واقعات چنتا ہے جو چبھتے ہوئے، اچھوتے، منفرد اور نسبتاً متنازع اور دلچسپ ہوں۔ "(۳۶)

خاکہ نگاری میں شخصیت کا بیان اہم ہے اس وجہ سے اہم واقعات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ حقیقی مواد کو ترجیح دی جاتی ہے اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ تخّیل کا خاکہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خاکہ نگار خاکہ کے لیے جو مواد حاصل کرتا ہے وہ موضوع خاکہ سے اس کے ذاتی تعلق کی بنا پر اس کے پاس ہوتا ہے یا پھر موضوع خاکہ کی تصانیف اس کے اقوال، تقاریر اور خطوط وغیرہ سے مواد حاصل کر کے خاکہ لکھا جاتا ہے۔ مواد کے حصول کا ایک ذریعہ موضوع خاکہ کے دوست احباب اور رشتہ دار بھی ہوسکتے ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے تمام عناصر خاکہ نگاری کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ان عناصر کی موجودگی سے ہی ایک خاکہ صحت کے اعتبار سے موزوں ہو گا۔ اگر ایک خاکے میں اختصار، وحدتِ تاثر، کردار نگاری، منظر نگاری، اُسلوب کی دل کشی جیسے عناصر موجود ہوں گے اور مواد کی تنظیم وترتیب درست انداز میں کی گئی ہو گی تو ایک جاندار خاکہ قاری کو پڑھنے لیے دستیاب ہو گا۔

ج۔ مولوی عبدالحق تعارف وخدمات:

مولوی عبدالحق وہ نام ہے جس نے اپنی تمام زندگی اردو کے لیے قربان کر دی۔ آپ کی انہی خدمات کی بدولت آپ کو پاک وہند میں "بابائے اردو" کے نام پہچانا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا تعلق ضلع میرٹھ ہاڑپور سے تھا۔ آپ کے خاندان کے زیادہ تر افراد کا مغلیہ سلطنت کے محکمہ مال سے منسلک رہے اور ان نے افراد نے شاہ جہاں کے عہد میں اسلام قبول کیا۔ شیخ علی حسین آپ کے والد تھے اور آپ کی والدہ "سرواہ" سے تعلق رکھتی تھیں جو بہت ہی پرہیز گار اور دین دار خاتون تھیں۔ مولوی عبدالحق کی ولادت ۲۰ اگست ۱۸۷۷ء کو ہوئی۔ آپ کا بچپن "سرواہ" میں گزرا۔ میٹرک کا امتحان آپ نے پنجاب سے پاس کیا اور پھر مزید تعلیم کے لیے آپ کو علی گڑھ بھیج دیا گیا جہاں پر آپ نے ۱۸۵۵ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ مولوی عبدالحق کا تعلق ایک اوسط مگر خوشحال گھرانے سے تھا۔ گھر کا ماحول دینی تھا اس دینی ماحول کا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر ہوا۔ آپ بچپن سے انتہائی کم گو اور ذہین تھے آپ کو مطالعے کا حد درجہ شوق تھا آپ کے اس شوق کو علی گڑھ میں بہت زیادہ تسکین ملی کیونکہ وہاں علمی شخصیات کی کمی نہ تھی اس کا آپ کو بھرپور فائدہ ہوا۔ علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوران آپ کو اردو کی ترویج وترقی کا بھرپور موقع ملا۔ آپ نے زندگی کا ہر پل اردو کے نام کر دیا آپ کی اردو سے دل لگی اور عشق کی بدولت "انجمن ترقی اردو" کا ظہور ہوا۔ مولوی عبدالحق کا دائرہ کار اردو کی تمام اصناف تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ کا اُسلوب منفرد قسم کا ہے۔ ۱۸۸۸ء میں مولوی عبدالحق جب علی گڑھ

کالج آئے تو یہاں اسٹریچی ہال کی تعمیر تقریباً مکمل ہونے والی تھی اس طرح عبدالحق نے بحیثیت طالبِ علم علی گڑھ کالج کی دیواروں کو اٹھتے اور کالج کو شہرت کی بلندیوں پر جاتے دیکھا۔ مولوی عبدالحق جب ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ تشریف لائے تو اس وقت علی گڑھ مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے مرکزِ نگاہ تھا۔ برصغیر کے کونے کونے سے مسلمان نوجوان علم کے حصول کے لیے علی گڑھ کا آتے تھے۔ مولوی عبدالحق کو علی گڑھ کا علمی وادبی ماحول بہت پسند آیا اس ضمن بارے وہ لکھتے ہیں:

> "میں کالج میں ایک مَٹھا طالب علم تھا نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا نہ یونین میں حصہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈنٹ و سیکرٹری کے ہنگاموں میں شامل ہوا کالج میں کئی انجمنیں تھیں، میں نے نہ ان میں شرکت کی، البتہ "اخوان الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے دو ایک مضمون پڑھے ایک مضمون میں نے سینٹ پال پڑھا اس دن سے طالب علم مجھے سینٹ پال کہنے لگے۔"(۳۷)

علی گڑھ میں آپ کی طالب علمی کے زمانے میں آپ کو مضمون نویسی کی بدولت "لارڈ ڈینس ڈاؤن" تمغہ بھی ملا۔ آپ کی ان ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر سرسید نے آپ کو "تہذیب الاخلاق" رسالہ کے سلسلے میں کام پر لگا دیا۔ جب سرسید جیسے لوگوں نے آپ پر نظرِ کرم کی اور آپ حالی و شبلی جیسے لوگوں کے قریب ہوئے تو آپ کی صلاحیتوں میں نکھار آنا ہی تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ کا جو رشتہ قلم سے جوڑا وہ تادمِ مرگ قائم رہا۔ ۱۸۹۴ء میں جب آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو آپ ملازمت کے سلسلے بمبئی گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات محسن الملک سے ہوئی جو اس وقت حیدرآباد میں فنانس سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہاں حیدر آباد میں مولوی عبدالحق کو مدرسہ آصفیہ کی صدر مدرسی کا عہدہ بھی ملا اس کا ذکر تحسین سروری نے کچھ اس انداز میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "مولوی عبدالحق اور ظفر علی خان نے محسن الملک کے سفارشی خط لے کر ۱۸۹۸ء میں حیدرابا د کی راہ لی۔ حیدرآباد میں اس وقت ہوم سیکرٹری مولوی عُزیر مرزا تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے ان جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی قدر کی اور اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا ان کے ذمہ مترجمی کا کام تھا اسی دوران میں (۱۸۹۹) میں ایک موقع پر عبدالحق کی ملاقات افواجِ آصفیہ کے سپہ سالار افسرالملک نواب افسر جنگ سے ہوئی۔ وہ علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے چنانچہ انھیں اپنے رسالے "افسر" کی

ادارت کے لیے منتخب کرلیا۔ اور ساتھ ہی اپنی قائم کی گئی درس گاہ "مدرسہ آصفیہ" کی صدر مدرسی کی پیش کش بھی کر دی۔"[۳۸]

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب حیدر آباد میں پہلے ہوم سیکرٹری کے مترجم رہے اور بعد ازاں ۱۸۹۹ میں وہ صدر مدرس آصفیہ مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب تقریباً بارہ سال تک مدرسہ آصفیہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر حیدر آباد چھوڑ گئے۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے مولوی عزیر مرزا کی وفات کے بعد انجمن کے معتمد کا عہدہ بھی آپ کو دے دیا گیا ان دنوں آپ کی رہائش مقبرہ رابعہ درانی والی عمارت میں تھی یوں انجمن کا دفتر بھی علی گڑھ سے اورنگ آباد ہی آ گیا۔ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے بھی مولوی عبدالحق نے اردو کی بہت زیادہ خدمت کی۔ کالج میں اردو کی تمام کلاسیں خود ہی لیتے تھے۔ اورنگ آباد کالج میں آپ نے طلباء کو انشاء پردازی کی طرف مائل کرنے کے لیے کالج سے ایک میگزین "نورس" کا اجراء کیا گیا۔ آپ ۱۹۲۹ء میں اورنگ آباد کالج کے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اس کے بعد آپ کا تقرر بطور پروفیسر جامعہ عثمانیہ میں ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کا مقصد جدید علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔

۱۹۳۸ء میں جب انجمن کا دفتر دہلی منتقل کیا گیا تو مولوی صاحب بھی اپنے ذاتی کتب خانے کے ساتھ دہلی ہی آ گئے۔ جب ۱۹۴۸ء کے ہنگاموں کی وجہ سے انجمن روبہ زوال ہوئی تو مولوی صاحب بہت مایوس ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انجمن کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ آپ نے کراچی میں "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد رکھی۔ پاکستان میں بھی انجمن ترقی اردو مختلف نشیب وفراز دیکھتی رہی لیکن مولوی عبدالحق کے پائہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ انجمن کو انھوں نے اپنی مرضی سے چلایا۔ ان کا یہ عمل مجلس نظامت کو بالکل پسند نہ تھا۔ انہی ایّام میں مولوی صاحب کی صحت بھی کچھ مستقل خراب رہنے لگی۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹروں کے مشورے پر ان کو مری منتقل کیا گیا۔ مری کے کمبائنڈ ملٹری اہسپتال میں آپ بریگیڈیر ڈاکٹر سرور صاحب کے پاس زیر علاج رہے۔ مولوی صاحب کو سرطان کا مرض لاحق تھا ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ جب مرض نے شدّت اختیار کی تو طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور سرطان کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ آپ نے ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔ مولوی صاحب کی موت کی خبر علمی اور ادبی حلقوں میں آگ کی طرح پھیلی۔ کراچی کے تمام تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد "انجمن ترقی اردو" کے دفتر اُمڈ

آئی۔ مولانا احتشام الحق نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ کے آخری دیدار کے لیے تقریباً پندرہ ہزار لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔

مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات:

مولوی عبدالحق نے اردو کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی اپنے ابتدائی مضامین کے متعلق انھوں نے ایک خط ڈاکٹر عبادت بریلوی کو تحریر کیا جس کا یہاں ذکر ضروری ہے یہ خط ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لکھا گیا وہ لکھتے ہیں:

> "میرے تین مضامین جامعہ عثمانیہ میں چھپے تھے ایک "ایہام" اور دوسرا "چندہ" چندہ تو کچھ نے لوگوں الگ بھی چھاپ دیا لیکن "ایہام" مجلہ عثمانیہ سے مل سکتا ہے تیسرا "قدیم اردو میں قران کے ترجمے" "اردو" میں چھپا تھا ایک اور مضمون "انسانیت اور درندگی" مولانا ظفر علی خان کے رسالہ میں چھپا تھا، جو کسی زمانے میں انہوں نے الٰہ آباد سے نکالا تھا۔ یہ مضمون نصاب کی کتابوں میں بہت نقل ہوا ہے۔ ایسے ہی مضامین قدیم علی گڑھ میگزین وغیرہ میں بھی ہوں گے مگر وہ قابلِ ذکر نہیں۔ "دکن ریویو" (ظفر علی خان) میں بھی کچھ مضمون لکھے تھے۔ عالمِ اسلامی پر ایک مسلسل مضمون تھا جو کم و بیش ۳۰۰ صفحوں پر ختم ہوا مگر اس قابل نہیں کہ مجموعہ میں شامل کیا جائے، زمانہ بدل گیا ہے۔"[۳۹]

مولوی عبدالحق نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۹۰۵ء میں مولانا ظفر علی خان کی کتاب "جنگِ روس اور جاپان" میں مقدمہ لکھ کر کیا اور اس سلسلے کا اختتام آپ کی وفات پر ہوا جب آپ نے "قاموس الکتب" کا مقدمہ لکھا۔ اس وقت آپ بستر مرگ پر تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ان میں اردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا حصہ، مرحوم دہلی کالج، سیّد احمد خان (حالات وافکار)، افکارِ حالی، نصرتی ملک الشعراء بیجاپور، سر آغا خان کی اردو نوازی، اردو زبان میں اصطلاحات کا سلسلہ، مرھٹی زبان پر اردو کا اثر، انتخاب کلام میر، چند ہم عصر، قواعدِ اردو اور اردو صرف و نحو جیسی کتابیں شامل ہیں جبکہ آپ کی تالیفی خدمات میں "دی اسٹنڈرڈ اردو ڈکشنری، اسٹوڈنٹس ڈکشنری جیسی لغات ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی رودادیں، آپ کے خطبات، مکاتیب وغیرہ بھی مولوی عبدالحق کا تصنیفی اور تالیفی سرمایہ ہے۔ آپ کی تصانیف نے اردو کے دامن کو وسعت بخشی۔

مولوی عبدالحق بطور خاکہ نگار:

مولوی عبدالحق نے اپنی تمام زندگی اردو کی ترویج واشاعت کے وقف کی۔ آپ کا دائرکار اردو کی تمام اصناف تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہاں ان کی بطور خاکہ نگار خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا، خاکہ نگاری کے حوالے سے "چند ہم عصر" مولوی عبدالحق کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کا محرک ان کی ہم عصر شخصیات کا بچھڑنا لگتا ہیں۔ مولوی عبدالحق کی ہم عصر علمی وادبی شخصیات جب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں تو مولوی عبدالحق کو ان کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ اس کمی کو انھوں شخصیات کی لفظی تصویریں بنا کر پوری کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مولوی عبدالحق نے اپنے ہم عصروں کے کارناموں، خوبیوں اور خامیوں کی یاد تازہ کی تاکہ کچھ دلی سکون میّسر آسکے۔ علمی اور ادبی شخصیات کے علاوہ آپ نے معاشرے کے دو معمولی کرداروں کی بھی مرقع کشی کی۔ آپ نے شخصیتوں کے بیان میں غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ کے ہر خاکے میں شخصیت سے ہمدردی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے معائب و محاسن بیان کرنے میں شخصیات کی عظمت اور شہرت کو بالائے طاق رکھا ہے اور دوستی اور تعلقات کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ آپ کی خاکہ نگاری میں عقیدت مندی کی بجائے حقیقت جھلکتی ہے۔ آپ نے شخصیات کی سچی تصاویر سامنے لائیں۔ مولوی عبدالحق کا معیار انسانیت تھا آپ نے حالی جیسے عظیم شخص اور معمولی مالی کی عظمت، وقار اور شان وشوکت کو بیان کیا ہے آپ نے ہمیشہ کام کی ستائش کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے شعراء، سیاست دانوں اور مصلحین کے ساتھ ساتھ نام دیو ،مالی جیسے معمولی حیثیت کے لوگوں کے بھی خاکے لکھے اور ان کی کرداری خوبیوں نے مولوی صاحب اس طرح اُجاگر کیا کہ یہ زندہ جاوید ہو گئے۔

ان میں ایک کردار دیو مالی اور دوسرا معمولی سپاہی تھا۔ یہ دونوں کردار کسی کی مدد کے محتاج نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے طور پر کیا۔ ان کی یہ خوبی مولوی عبدالحق کو بہت زیادہ اچھی لگی۔ مولوی عبدالحق فرماتے ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں سے اپنی زندگی میں ملے ان میں ادیب وشاعر بھی تھے اور مفکر اور مجتہد بھی، عالم وفاضل بھی ہیں اور صاحبِ ثروت بھی لیکن ان کے بقول دو چار ہی ملے جن میں انسانیت بھی تھی اور یہ وہ شے ہے جو بہت کمیاب ہے۔ مولوی عبدالحق نے ان کرداروں کو متاثر کن انداز سے پیش کیا۔ مولوی عبدالحق نے سر سیّد، حالی اور محسن الملک پر جو خاکے تحریر کیے ہیں وہ ان کی نجی مصروفیات اور چھپے پہلوؤں کو آشکار سامنے لاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے ہاں معروضیت نظر آتی ہے آپ نے جو کچھ کسی

شخص میں دیکھا یا پایا اس کو بیانکر دیا۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں میں سلاست اور سادگی ہے۔کچھ جگہوں پر مولوی عبدالحق نے تنقید اور طنز سے بھی کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں کردار نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں، معروضیت بھی ہے اور سماجی پسِ منظر کو بھی بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔مولوی عبدالحق خاکوں میں سیرت کے نقش و نگار نکھارتے ہیں اور آپ کے ہاں بُغض وعناد نہیں آتا۔مولوی عبدالحق نے اپنے فن کی بدولت پیش کردہ شخصیات کو جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا انسان دکھایا ہے۔ان کے کردار محض سایوں کی طرح نہیں بلکہ قاری ان ایسے کو پہچانتا ہے جیسے کئی سالوں سے ان کو پہچانتا ہے۔ آپ نے نے نہایت معمولی جزئیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔عام طور پر جن چھوٹے چھوٹے واقعات کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ان کو مولوی عبدالحق نے اپنی فنکارانہ صلاحیّتوں کی بدولت اہم اور قیمتی بنادیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جن معتبر شخصیات کو بیان کیا ہے دنیائے ادب میں لازوال رہیں گی اور ان کو ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

د۔شاہد احمد دہلوی:تعارف وخدمات:

شاہد احمد دہلوی اردو کے مشہور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کو ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کا ادبی رسالہ "ساقی" آپ کی پہچان ہے۔ساقی کو شاہد اور شاہد کو ساقی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں بیس بائیس بچے پیدا ہوئے لیکن تین کے سوا باقی چھوٹی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔دو بیٹیاں اور ایک بیٹا مولوی بشیر الدین احمد تھے جن کو اللہ نے زندگی عطا کی۔ مولوی بشیر الدین احمد، شاہد احمد دہلوی کے والد محترم ہے۔شاہد احمد دہلوی کی پیدائش ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو ہوئی۔ آپ کی والدہ آپ کو بچپن میں ہی چھوڑ گئی تھیں۔ آپ کے والد نے آپ کی ابتدائی تعلیم کی سرپرستی کی اس ضمن میں شاہد احمد دہلوی خود لکھتے ہیں:

> "ابّا ہمیں خود پڑھاتے تھے،ایک ماسٹر بھی ہمیں پڑھانے آتا تھا،ایک یورپین گورنس بھی ہم پر رکھی گئی،یہ انگریزی میں ہم سے بات کرتی تھی اور کھانے، لباس، کھیل ،سیّر ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔کانونٹ اسکول میں صرف ہم ہی ہندوستانی بچے تھے، باقی سب لڑکے لڑکیاں یورپین تھیں۔ایک سال کی الٹا پلٹی میں ہی ہم انگریزی روانی سے بولنے لگے تھے۔"(۴۰)

کانونٹ اسکول میں تعلیم کے بعد شاہد احمد کا داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوا لیکن تعلیم میں ان کا دل بالکل نہ لگا حالانکہ ان کی بہن اور بھائیوں کا داخلہ بھی وہاں ہی کرایا گیا تھا۔ علی گڑھ میں ان لوگوں کی خدمت کے باقاعدہ طور پر ایک خدمت گار بھی رکھا گیا۔ ان تمام تر آسائشوں کے باوجود شاہد احمد تین سال بعد دہلی واپس آ گئے اور یہاں پر ایک اینگلو عربیک اسکول میں اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھایا۔ میٹرک کے بعد شاہد احمد دہلوی کے والد یہ چاہتے تھے کہ وہ طب اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے شاہد احمد کو ایڈنبرا بھی بھیجا لیکن کچھ ذاتی مجبوریوں کی بدولت ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ یوں شاہد احمد نے لاہور کے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں شاہد احمد کے والد بیمار تھے اور ان کی اپنی بیوی بھی علیل تھیں۔ اس لیے ان کا دل یہاں بھی نہ لگ سکا۔ یہاں سے شاہد احمد نے ایک خط اپنے والد کو لکھا کہ میں آپ کی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں ہے میں بی اے اور ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اطلاع دے کر شاہد احمد واپس دہلی آ گئے۔ اس کے بعد کی صورتِ حال پر شاہد احمد دہلوی خود لکھتے ہیں:

> "دلی آ جانے کے بعد میں نے بی اے (آنرز) انگریزی ادبیات میں کیا اور فارسی (آنرز) کے دو پرچے بھی کیے۔۔۔۔ ۱۹۲۹ء میں مشن کالج میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ یہاں کے استادوں دو قابلِ ذکر ہیں، ایک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (حال وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) دوسرے شمس العماء مولوی عبد الرحمان مرحوم۔"(۴۱)

شاہد احمد دہلوی نے دو شادیاں کیں۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو ان کی پہلی شادی ہوئی لیکن شادی کے دوسرے ہی سال ان کی بیوی کو ایسی بیماری لگی جو آخر کار ان کی موت کا سبب بنی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی رفیقہ حیات چل بسی۔ چونکہ ان کی اہلیہ کافی عرصہ بیمار رہیں تو اس وجہ سے شاہد احمد کی زندگی پر بھی کچھ منفی اثرات پڑے۔ شاہد احمد نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد اپنی بڑی سالی کی بیٹی عاصمہ بیگم سے دوسری شادی کی۔ عاصمہ بیگم وہ خاتون تھیں جو تقسیم کے بعد شاہد احمد کے ساتھ پاکستان آئیں۔ انھوں نے "ساقی" کی ادارتی سرگرمیوں میں شاہد احمد کا بہت ہاتھ بٹایا۔ وہ شاہد احمد کے شوقِ موسیقی میں ان کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے فرسٹ ایڈ اور ہوم نرسنگ میں ٹریننگ لی۔ ایم۔ اے کیا وہ شاہد احمد کے مزاج کو خوب جانتی تھیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے دل میں اُتر گئیں۔ شاہد احمد نے کچھ عرصہ ریلوے میں ملازمت بھی کی لیکن جلد ہی اس کو

چھوڑ دیا دراصل وہ اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کی تدوین اور اشاعت کے کام کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے اس جانب شاہد احمد نے بھرپور توجہ کی۔ شاہد احمد نے احباب کے مشورے اور تعاون سے یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو "ساقی" کا اجراء کیا۔ ساقی کا چرچا تو بہت ہوا لیکن آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے کتابوں کا کاروبار بھی کیا اور اس مقصد کے لیے "ساقی بک ڈپو" شروع کیا۔ ساقی بک ڈپو کی کتب وّصی اشرف کے "کتب خانہ علم وادب" سے دستیاب ہوتی تھیں جو جامع مسجد دہلی کے زیرِ سایہ اردو بازار میں واقع تھا۔ ساقی کے علاوہ دو رسالے جو دہلی سے شائع ہوتے تھے شاہد احمد ان کے بھی مدیر رہے۔ ایک رسالہ "شاہجہاں" اور دوسرا "کامران" تھا۔ شاہجہاں ادبی معرکوں کے لیے مشہور تھا جبکہ "کامران" ایک فلمی رسالہ تھا مذہبی حلقوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور یوں "کامران" جلد ہی بند ہو گیا۔ شاہد احمد کو موسیقی سے بے حد دل چسپی تھی اس سلسلے میں انھوں نے ہندو اور مسلمان اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے شاہد احمد "ساقی" کی بدولت بہت مشہور ہو چکے تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی لیکن فسادات کی کی وجہ سے ان کی جائیداد اور روپیہ پیسہ سب ڈوب گیا اور وہ بھی دوسرے مسلمان مہاجرین کی طرح ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ شروع کے ایّام ایم۔ اسلم کے گھر میں رہے۔ لاہور میں شاہد احمد نے "ساقی" کے ڈیکلریشن کے لیے بہت جان ماری لیکن یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ شاہد احمد میاں اسلم کے مشورے پر کراچی چلے گئے اور پھر وہی مستقل سکونت اختیار کی۔ کراچی پہنچ کر "ساقی" کے اجراء کی کوششیں شروع کیں اور جلد ہی آپ کو ڈیکلریشن حاصل ہو گیا۔ اس سلسلے میں سابق کمشنر کراچی ہاشم رضا نے بہت زیادہ مدد کی ۔اس طرح "ساقی" کا پہلا شمارہ کراچی سے جاری ہو گیا۔ اپنے کراچی میں قیام کے دوران میں شاہد احمد دہلوی کو ایک بڑے کنبے کی کفالت کا چیلنج درپیش تھا۔ اس ضمن میں آپ نے اپنے موسیقی کے شوق کو کام میں لایا اور بحیثیت میوزک سپروائزر ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ آپ کی تنخواہ پانچ سو تھی۔ ریڈیو میں آپ کی ملازمت کنٹریکٹ پر تھی۔ ریڈیو کی ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے "ساقی" کے لیے بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ادبی تحریکوں اور انجمنوں میں شریک رہے۔ "انجمن ادبی جرائد" اور ادیبوں اور شاعروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے "رائٹرز گلڈ" میں بھی آپ کا کردار نمایاں رہا۔ سیٹو کے ممالک پاکستانی ثقافت سے روشناس ہونا چاہتے تھے۔ جب ایسے لوگوں کی ضرورت پڑی جو پاکستانی ثقافت کو روشناس کرا سکتے تھے تو شاہد احمد دہلوی جیسے لوگوں کا نام ہی سب سے پہلے سامنے آیا۔ شاہد احمد دہلوی "سیٹو" کے جنرل سیکرٹری پوٹے سیر اسن کی دعوت پر تھائی لینڈ اور فلی پینز میں پاکستانی موسیقی پر لیکچر دینے گئے۔ ۱۹۵۹ء میں ڈھاکہ میں ہونے والے "یومِ

امیر خسرو" کے موقع پر بھی آپ نے امیر خسرو کی اختراعات پر لیکچر دیا۔ ۱۹۶۳ء شاہد احمد کی ان علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ان کو "افتخارِ ادب" کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں: "۱۴ اگست ۱۹۶۳ء کو اخباروں میں اعلان ہوا کہ اس سال عطیہ صدر "افتخارِ ادب" مجھے دیا گیا اور اس اعزاز کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی تھے"(۴۲)۔ شاہد احمد دہلوی کا علم وادب کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی تعلق تھا وہ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ شاہد احمد دہلوی کو ۱۹۶۵ء میں ٹانگ میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی تو ان کے ڈاکٹرز نے ان کو آپریشن کا مشورہ دیا لیکن شاہد احمد دہلوی ٹال مٹول کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر آپریشن کے بغیر ہی صحت بحال ہو جائے تو اچھا رہے گا جبکہ ان کے ڈاکٹر دلاور عباس کی حتمی رائے آپریشن ہی تھی۔ ۱۹۶۶ء کا سال شاہد احمد دہلوی پر بہت بھاری رہا اس سال ان کے بہنوئی کا جوانی میں انتقال ہوا۔ ہم زلف کا جواں سال بیٹا حادثے کا شکار ہوا اور اس سے بھی بڑھ کر ان ان کی بیٹی پر فالج کا حملہ ہوا جو باوجود علاج کے جانبر نہ ہو سکیں۔ ان تمام واقعات نے شاہد احمد دہلوی پر قیامت ڈھادی۔ اس وقت ان کی ٹانگ کا آپریشن بھی ہو چکا تھا لیکن ان کی صحت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ تبدیلی ماحول کے لیے ان کو لاہور اور پنڈی بھی لے جانے کا اہتمام کیا گیا لیکن راستے میں ان کی طبیعت بگڑی اور ان کو واپس کراچی پہنچا دیا گیا۔ فروری کے مہینے میں شاہد احمد دہلوی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ تقریباً ۲۲ روز تک ہسپتال میں رہے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹرز نے ان کو گھر جانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ پڑھنے لکھنے کی سرگرمیوں کو ترک کرینگے اور کھانے پینے میں بھی پرہیز سے کام لیں گے۔ لیکن شاہد احمد کو دل کا عارضہ لاحق ہو چکا تھا اور پھر ایک دن بقول ان کی اہلیہ عاصمہ بیگم کے مطابق:

> "وہ گھر آئے، بیٹی فرزانہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ تقریباً گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹے، کچھ دیر بعد کھانسی کا دھسکا ہوا، خود اٹھ کر دوا پی، دوبارہ کھانسی اٹھی اور سانس میں خرخراہٹ پیدا ہوئی۔۔۔ موت نے وقت غنیمت جانا (پونے بارہ بجے) اکسٹھ سالہ انسان کو ساکت کر گئی۔"(۴۳)

ادبی خدمات:

تحریریں اور مضامین ہیں جو مختلف اوقات میں رسائل میں چھپتی رہیں۔ شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات میں ان کی تصانیف، تراجم، خاکے اور افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار پیشِ خدمت ہے۔

تصانیف:

۱۔"سرگزشتِ عروس"(ناول)۱۹۳۶ء

۲۔"دلّی کی بپتا"(رپورتاژ)۱۹۵۰ء

۳۔"گنجینہ گوہر"۱۹۶۲ء

۴۔:اجڑا دیار"۱۹۶۷ء

۵۔"بزمِ خوش نفساں"۱۹۸۵ء

تراجم:

شاہد احمد نے جولائی ۱۹۳۱ء میں ترجمہ نگاری کا آغاز کیا۔آپ کے دوتراجم ۱۹۳۴ء میں "نرگسِ جمال"اور"پروین وثریا" ازمارس میتر لنک" ساقی بک ڈپو" نے دہلی سے شائع کیے۔۱۹۳۷ء میں "فاؤسٹ "ڈرامہ از: گوئٹے قسط وار شائع ہوا۔اس کے بعد "پھانسی"ناول ۱۹۴۴ء،"غریب لڑکے جو نامور ہوئے"از:بولٹن۱۹۴۸ء،حیرت ناک کہانیاں از: نیتھینئل ہاتھورن۱۹۵۵ء،"انوکھی کہانیاں"از:: نیتھینئل ہاتھورن۱۹۵۷ء،"دھان کا گیت" از:مس آئی لن چانگ۱۹۵۷ء،عثمان بطور از:گوڈ فرے لیاس۱۹۶۱ء،"آپ کے بچے کی صحت"از:جے روز گالا گھیر ۱۹۶۳ء،"انتخابِ معاش"از:ہمفریز جے انتھنی۱۹۶۳ء،"بچے بد تمیزیاں کیوں کرتے ہیں"از:جارج ڈبلیولیونارڈ" جیسے تراجم مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے۔شاہد احمد دہلوی نے ترجمہ نگاری کے ذریعے اردو کے دامن کو وسیع کیا۔اشرف صبوحی شاہد احمد دہلوی کی ترجمہ نگاری کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "شاہد احمد کے ترجمے کس رتبے کے ہیں۔اس کا اندازا اس سے ہو گا کہ مولوی عنایت اللہ جو بڑے فاضل اور نامور مترجم گزرے ہیں ، آپ کے تراجم کو پسند کرتے تھے"(۴۴)

خاکے:

شاہد احمد دہلوی کے (غیر مرتبہ) خاکوں کی تعداد ۱۳ کے قریب ہیں۔یہ وہ خاکے ہیں جو "ساقی" میں شائع ہوئے۔اس کے علاوہ "زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے" بھی غیر مرتبہ خاکے ہی ہیں جن کی تعداد ۵۳ ہیں۔

افسانے:

شاہد احمد دہلوی نے ۱۳ کے قریب افسانے بھی لکھے ہیں جن میں "مالی کی لڑکی""شبابِ اردو" لاہور نے فروری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دیوانہ، اچھن کی ماں، انوکھی عید، گمراہ ہستیاں، قتل، طلسمی پہاڑی، بدنصیب شہزادہ، فوٹو گرافر، مامتا، دیوانہ، تقلیدِ شباب اور خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دنیا "ساقی میں شائع ہوئے۔ شاہد احمد دہلوی کے ترجمہ شدہ افسانوں اور ڈراموں کی تعداد ۵۶ کے قریب ہے جو زیادہ تر "ساقی" اور "نقوش" میں شائع ہوئے۔

مضامین:

شاہد احمد دہلوی مختلف مضامین لکھ کر بھی اردو کے دامن کو وسعت بخشی۔ آپ نے دہلی کی ثقافت کے متعلق بہت ہی دلچسپ مضامین لکھے۔ آپ کے ان مضامین میں دہلی کی ثقافت رقص کرتی نظر آتی ہے۔ ان مضامین کی تعداد ۱۴ ہے۔ آپ نے موسیقی کے متعلق بھی ۱۵ کے قریب مضامین لکھے جو موسیقی سے آپ کے شغف کی دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے جن کی تعداد ۱۷ ہے۔ یہ سارے کے سارے مضامین "ساقی" کے مختلف شماروں کی زینت بنیں۔

رپورتاژ/روداد:

۱۔ "جامعہ دہلی کا یومِ تاسیس "۲۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء

۲۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی کا اجلاس "منعقدہ ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء کی روداد

۳۔ "نجی خط" بنام مبشر احمد (غیر مطبوعہ) ۲۱/اکتوبر ۱۹۴۷ء

۴۔ "حیدرآباد میں منعقدہ میوزک کانفرس کی روداد" فروری ۱۹۵۴ء

۵۔ "جاگ اٹھا ہے پاکستان" فروری ۱۹۶۶ء

۶۔ "بھارت اور پاکستان کی جنگ" جون ۱۹۶۶ء

۷۔ "بھارت اور پاکستان کی جنگ" ستمبر ۱۹۶۶ء

اس کے علاوہ کچھ متفرق مضامین بھی ہیں جن میں "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے "خطبہ استقبالیہ "نالوں کا جوابِ آخر" گزارش "ایک اور گزارش "کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی" سخن ہائے گفتنی "سوویت وسطی ایشیا کے مسلمان "زمانے کے انداز بدلے گئے" اور "سیٹو وغیرہ شاہد احمد دہلوی ایسے مضامین ہیں جو مختلف رسائل

میں چھپتے رہے۔ شاہد احمد دہلوی نے ساقی کے اداریے "نگاہ اوّلین" کے عنوان سے خود تحریر کیے ان کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے۔

شاہد احمد دہلوی بطور خاکہ نگار:

شاہد احمد دہلوی نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک سترہ خاکے لکھے جن کو "گنجینہ گوہر" میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ شاہد احمد نے "دلی کا ایک دور" کے عنوان سے بارہ شخصیتوں کے نقوش بھی "نقوش" کے شخصیات نمبر میں لکھے ہیں۔ اشاعت کے اعتبار سے "عظیم بیگ" کے خاکے کو ان کا پہلا خاکہ مانا جاتا ہے لیکن خود شاہد احمد دہلوی کی تحریر کے مطابق میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پہلا خاکہ ایم اسلم پر لکھا ہو گا۔ ایم اسلم کے خاکے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "اس مضمون کا کچھ حصّہ بیس بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور کچھ حصّہ دس بارہ سال پہلے۔ مضمون کی نظر ثانی میں نے کر دی ہے مگر اس میں کسی قسم کا رد وبدل کرنا مناسب نہیں سمجھا"(۴۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق شاہد احمد دہلوی کو خاکہ نگاری کی طرف انھوں نے متوجہ کیا اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے ۔۔۔ اس زمانے میں یادوں کا اظہار ان کا روز مرّہ بن گیا تھا ۔ وہ گھنٹوں بیتے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتے اور میں ان سے کہتا شاہد احمد یہ سب کچھ لکھ دیجیے۔"(۴۶)

گنجینہ گوہر کے مقدمے میں بھی جمیل جالبی یہی ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے شاہد احمد دہلوی پر زور دیا کہ:

> "ان تمام لوگوں کے حالات قلم بند کر دیں۔ میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گئے کہنے لگے، میں ان کی فہرست مرتب کرتا ہوں ۔۔۔ فہرست بنانے بیٹھے تو بنتی چلی گئے ۔۔۔ مکمل ہونے پر نہ آئی ۔۔۔ تھک گئے ۔۔۔ نام گنے ۔۔۔ معلوم ہوا تین سو بہتّر نام ہیں۔"(۴۷)

محمد حسین آزادؔ کی طرح شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا مقصد بھی تاریخی معلومات اور روایات اور دیکھی سُنی باتوں کو محفوظ کرنا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات کو جلوت اور خلوت میں دیکھا اُن کو بیان کر دیا۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکے فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ ہیں۔ ان کے ہاں قطعیت پائی جاتی ہے وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ قطعی اور آخری ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ ان کی ذاتی معلومات اور تعلقات تھے۔ ڈاکٹر ایوب قادری شاہد احمد دہلوی کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں گنجینہ گوہر نایاب کتاب ہے۔۔۔ یہ کتاب زبان وبیان اور صداقت خلوص کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ڈپٹی کی غربت وافلاس، خواجہ حسن نظامی کی کتاب سازی، ایم اسلم کی شرافت، عظیم بیگ چغتائی اور میر اجی کی سچّی تصویر شاہد صاحب کا قلم ہی کھینچ سکتا ہے۔"(۴۸)

چہرہ کسی بھی شخصیت کا عکس پیش کرتا ہے۔ چہرہ نویسی خاکے کا اہم جزو ہے۔ شاہد احمد چہرہ نویسی میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ ان کی اس خوبی کو یحیی امجد یوں بیان کرتے ہیں:

"چہرہ نویسی کے باب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ دوسروں کے لکھے ہوئے چہرے پڑھ کر آپ دھوکہ کھاسکتے ہیں۔ اس چہرے سے ملتی جلتی شکل پر اس کا خاص شکل کا گمان کرسکتے ہیں مگر شاہد صاحب کا "چہرہ" اگر کہیں ملے گا تو اس خاص آدمی کی گردن پر۔"(۴۹)

چہرہ نویسی کے علاوہ شاہد احمد کسی بھی شخصیت کو من وعن پیش کرتے ہیں۔ وہ شخصیات کی کمزرویوں کو چھپاتے نہیں۔ وہ خامیوں کو کو بھی دل کش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی کی شخصیت کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

"کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا، ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔ پانوں کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے، اس کے علاوہ سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا ان کو شوق تھا۔ انھوں نے خوشامد کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہوگئے تھے۔"(۵۰)

چہرہ نویسی اور شخصی خامیوں کو دلکش انداز میں بیان کرتے ہوئے شاہد احمد واقعات کے انتخاب میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ شاہد صاحب نے ہمیشہ واقعات کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا۔ ان کے خاکوں میں

بیان کردہ تمام واقعات ان کے حسنِ انتخاب پر دلالت کرتے ہیں مولانا عبد السلام نیازی کی علمیت، ان کے جاہ و جلال اور غصّے بتانے کے لیے شاہد احمد واقعات کا انتخاب کس طرح کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں :"مولانا نے۔۔۔۔ایک دفعہ روح کی ماہیت پر جو صبح سے بولنا شروع کیا تو سارا دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی، صبح چار بجے لیکچر جاری رہا اور نا تمام رہا۔"(۵۱)

حسنِ انتخاب کے بعد اگر غور کیا جائے تو شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا ایک اور منفرد عنصر جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان کے پایا جانے والا "اختصار" ہے۔ خاکہ میں بات کو سلیقے اور اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ شاہد احمد کے خاکوں میں ان کی حیثیت کرداری ہوتی ہے۔ وہ نہایت روانی سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا اسلوب بھی بہت منفرد ہے۔ ان کی زبان ٹکسالی، سادہ اور شگفتگی سے بھرپور ہے۔ شوخی اور بے تکلفی آپ کے خاکوں کا طُرہ ہے۔ استعارات، تشبیہات، روز مرّہ اور محاوروں کو برتنے کا فن ان کو خوب آتا ہے۔ خاکہ نگاروں میں شاہد احمد دہلوی اپنے اسلوب کی بنا پر ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یحیٰی امجد نے شاہد احمد دہلوی کے اندازِ تحریر اور فن کا موازنہ دیگر خاکہ نگاروں سے کیا ہے۔ وہ گنجینہ گوہر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> "شاہد صاحب کی آواز بڑی واضح انفرادیت رکھتی ہے۔ خصوصاً ان کا اسلوب انھیں دوسرے تمام خاکہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے۔ ان کی زبان، بول چال کے قریب تو ہے مگر اشرف صبوحی دہلوی کی طرح عین بول چال کی زبان نہیں بن جاتی۔ ان کے یہاں ایک ادب پارے کی سی متانت ہے اور اس کا وقار ہر لحظ سے برقرار رہتا ہے۔"(۵۲)

شاہد احمد دہلوی کی تحریروں میں متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے۔ ان کی تحریریں قاری کے دل و دماغ کو مسرور کرتی ہیں۔ بحیثیت خاکہ نگار شاہد احمد دہلوی کو ایک کامیاب خاکہ نگار ہے۔ انھوں نے انسان کو انسان کی شکل میں دیکھا اور بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی بیان کردہ شخصیات انسان کے درجے پر ہی رکھا ان کو فرشتہ ثابت نہیں کیا۔ شاہد احمد دہلوی نے جس شخصیت کی بھی تصویر کشی کی وہ ایک جیتے جاگتے کردار کی صورت میں قاری کے سامنے آئی۔ دراصل خاکہ نگاری کا فن بھی اسی امر کا متقاضی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات کو موضوع بنایا وہ مُدتوں یاد رکھے جائیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵، ص ۲۷

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹، ص ۲۲۹

۳۔ عائشہ طلعت خلجی، اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ، یونیورسٹی آف دہلی، ۲۰۱۲، ص ۰۵

۴۔ یحییٰ احمد، اردو میں خاکہ نگاری، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ، فرمان پوری، عفیف پرنٹر سلال کنواں دہلی، ۱۹۹۴، ص ۳۶۱

۵۔ راشد اشرف، اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے جلد اوّل، مرتب راشد اشرف، مشمولہ: پیش لفظ، اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ ص ۱۳

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، طبع اوّل، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۵۸۹

۷۔ احمد ندیم قاسمی، سنگ دوست از اے اے حمید، مشمولہ: اے حمید کی خاکہ نگاری، جودت پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۰۷

۸۔ محمد ہادی، مرزا، امراؤ جان ادا، کلاسک آرٹ پرنٹرس چاندی محل دریا گنج، دہلی، ۲۰۱۲، ص ۶۱

۹۔ محمد نذیر احمد، ڈاکٹر، بنات النعش، غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۶۵، ص ۱۲

۱۰۔ سعادت حسن، منٹو، منٹو کے افسانے، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱، ص ۸

۱۱۔ اشفاق احمد، اُجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰، ص ۰۹

۱۲۔ امتیاز علی تاج، سیّد، انار کلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی، ۲۰۱۱ ص ۳۵

۱۳۔ جمیل آذر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۳۲۴

۱۵۔ صفی مرتضٰی، سیّد، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنو، ۱۹۶۱، ص ۱۱۷

۱۶۔ قدیر زمان، سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء ص ۸۵

۱۷۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۰۳

۱۸۔شاہ علی، سیّد، حالی اور شبلی (سوانح نگار کی حیثیت سے) مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ، فرمان فتح پوری، عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی، ۱۹۹۴، ص ۳۳۰
۱۹۔صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء ص ۲۵
۲۰۔ایضاً ص ۲۷
۲۱۔ایضاً، ص ۳۰
۲۲۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، آفسٹ ورکس، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء ص ۰۹
۲۳۔ایضاً، ص ۱۶-۱۷
۲۴۔سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر، خطوط رشید احمد صدیقی، ساتھیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۸۶
۲۵۔ایضاً، ص ۹
26.en. Wikipedia.org/wiki/travelogue Dated:28-02-2019 Time:7:00 AM
۲۷۔یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، اظہار سنز پبلی شرز، ۱۹۶۹، لاہور، ص ۱۵
۲۸۔سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات توضیحی لغت، سنگ میل، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۱۷
۲۹۔گلنار بانو، ڈاکٹر، صوبہ سرحد میں خاکہ نگاری، گندھارا ہندکو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۱۶، ص ۰۱
۳۰۔محمد طفیل، مکرم، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۱۵
۳۱۔محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۲۳۲
۳۲۔بشیر سیفی، خاکہ نگاری: فن اور تنقید، ص ۱۵
۳۳۔غفور شاہ، ڈاکٹر، تعبیر حرف، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴، ص ۳۱۳
۳۴۔شمیم حنفی، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۳، ص ۱۱
۳۵۔صابرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ادب میں خاکہ نگاری، آرآر پرنٹرز لاہور، ۱۹۷۸، ص ۴۱
۳۶۔انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، ص ۹۸
۳۷۔معین الرحمن، سید، ڈاکٹر، ذکر عبدالحق، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۵، ص ۳۱
۳۸۔تحسین سروری، قومی زبان: مولوی عبدالحق اور رسالہ افسر، اگست ۱۹۶۶، ص ۱۶۹-۷۰

۳۹۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر خطوط عبدالحق بنام عبادت بریلوی، مجلسِ اشاعت مخطوطات ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۴ء ص۱۲۶

۴۰۔ محمد عارف، سیّد،ڈاکٹر،شاہد احمد دہلوی حالات وآثار، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۲۰۰۰ء، ص ۳۲

۴۱۔ ایضا، ص ۳۳

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۴۵۔ شاہد احمد، گنجینہ گوہر، مکتبہ نیا دور، کراچی، ۱۹۶۲، ص ۲۰۸۔۰۹

۴۶۔ شاہد احمد، بزمِ خوش نفساں، دیباچہ از ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۷

۴۷۔ شاہد احمد، گنجینہ گوہر، ص ۶

۴۸۔ ایوب قادری، کاروانِ رفتہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۳، ص ۱۲۷

۴۹۔ یحیی امجد، فن اور فیصلے، ص ۵۳

۵۰۔ شاہد احمد دہلوی، بزمِ خوش نفساں، ص ۶۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۵۴

۵۲۔ یحیی امجد، فن اور فیصلے، ص ۵۳

دوم:

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فکری تقابل

الف۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا فکری جائزہ

ادب اور انسانی زندگی سے گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ سماج، سیاست، مذہب ادب کے موضوعات ہیں ۔ادباء اور شعراء کی دل چسپی کے موضوعات بھی یہی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی تحریروں سے ان عناصر کو نکال باہر کریں۔ دراصل ان عناصر کے بغیر کوئی تحریر وجود میں ہی نہیں آسکتی۔ادب کی تمام اصناف غزل ، نظم،ناول، افسانہ،روزنامچہ ،مکاتیب،خاکہ سفر نامہ اور خود نوشت وغیرہ جس صنف کو اُٹھا کر دیکھ لیں سب کے سب درج بالا موضوعات سے پُر ہوں گے۔ چونکہ ادیب یا شاعر بھی ایک معاشرے کا حصّہ ہوتے ہیں اور معاشرے میں مذہبی ، سماجی، علمی اور ادبی سرگرمیاں روزانہ کا معمول ہوتی ہیں اس لیے ان سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ ایک ادیب یا شاعر اندونی اُپج سے مجبور ہو کر کچھ نہ کچھ ضابطہ تحریر میں لاتا ہے جو بظاہر ایک انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن یہ اُپج خارجی حالات و اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ایک ادیب یا شاعر خاص قسم کے مذہبی خیالات کا حامل ہو سکتا ہے۔اس کے خیالات کسی مخصوص سیاسی جماعت سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ سماج کے مختلف طبقات کے بارے میں وہ اپنی رائے کا مالک ہے۔ علم وادب کی دنیا میں کسی خاص گروہ کی حمایت کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ بیان کردہ تمام عوامل اس کی فکر کا تعّین کرتے ہیں اور یہ فکر اس کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ لکھاری حتی الوسع اپنی تحریروں میں غیر جانب داری کی کوشش کرتا ہے مگر کہیں نہ کہیں جا کر اس کی اپنی فکر اس کی تحریروں میں ضرور سما جاتی ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جب قاری ادب کی کسی بھی صنف سے لُطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے تو اس کو جابجا سیاسی وسماجی، علمی وادبی اور مذہبی واقعات کی چاشنی ملتی ہے جو دراصل مصنف کی فکر کی عکاس ہوتی ہے۔

یہاں ہم خاکہ نگاری میں عبدالحق اور شاہد دہلوی کی فکر کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے جس دور میں خاکہ نگاری کی اس عہد میں سیاست اور سماج کی کیا حالت تھی؟ علم وادب کی محافل کس طرح کی تھیں ؟ علم و ادب کی ترقی کے لیے کیا کوششیں ہوئیں ؟لوگوں کے آپس میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ سماج میں کن کاموں کو اچھا جانا جاتا تھا اور برائیاں کیا کیا تھیں؟ سیاست کیسی تھی اور سیاست

میں کون کون سر گرم تھا؟ اس ساری صورت حال کے دونوں خاکہ نگار عینی شاہد تھے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب ان لوگوں نے خاکہ نگاری کی ہو گی تو شعوری یا لاشعوری طور پر یہ صورت حال بھی ان کی خاکہ نگاری میں ضرور شامل ہوئی ہو گی۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہی صورت حال مصنف کی فکر کی تشکیل کرتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے مولوی عبد الحق اور شاہد احمد کے خاکوں میں ان کی سیاسی و سماجی، علمی و ادبی اور مذہبی فکر ضرور شامل ہو گی۔ خاکہ نگاروں کی اسی فکر کو یہاں ان کی خاکہ نگاری میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سیاسی و سماجی فکر

کوئی بھی ادیب یا لکھاری سیاسی و سماجی زندگی کے حقائق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ان ہی ادیبوں یا لکھاریوں کو زیادہ مقبولیت اور اہمیت ملی جن کو سیاست اور سماج کا پورا پورا شعور تھا اور جنھوں نے حالات اور عوامل کو اپنے فن میں ڈھالا۔ علی گڑھ کی تحریک نے ادیبوں اور شاعروں کے اندر یہ احساس اُجاگر کیا کہ اب ادب محض لذت پسندی اور تفریح کا ذریعہ نہیں ہو گا بلکہ سیاست اور سماج کو بھی ادب کا حصہ بنایا جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کی نشاۃ ثانیہ نے شعر و ادب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک خاموش کسی حد تک غیر منظم اور مبہم قومی احساس کا وہ نقطہ آخر تھا جس کے بعد ہندوستانی ذہن نے ایک نیا سفر شروع کیا۔۔۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے یہ انقلاب ایک پیچیدہ سماجی، تاریخی، معاشی اور سیاسی عمل کا مظہر تھا جس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ شاعروں اور ادیبوں کو شعوری طور پر ادب اور زندگی کے تعلق کی طرف متوجہ کیا۔"(۱)

بیسویں صدی کے شروع میں سیاست اور سماج ایک ہیجانی کیفیت سے دوچار تھے۔ سیاست اور سماج نے شاعروں اور ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ انقلاب روس نے بھی اپنے اثرات دکھائے۔ اب شاعروں اور ادیبوں نے باقاعدہ طور پر سیاست اور سماج کو اپنی تحریروں کا حصّہ بنانا شروع کر دیا۔ مولوی عبد الحق کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ مولوی صاحب سر سیّد کی تحریک کے سپاہی تھے اس لیے ان کی تحریروں میں سیاست اور سماج ایک معتدل انداز لیے ہوئے ہے۔ مولوی عبد الحق سر سیّد کی طرح حکومت سے ٹکراؤ کے خلاف تھے۔ مولوی عبد الحق نے "منشی امیر احمد" کے خاکے میں سر الفرڈ لائل اور کلب علی خان کے مکالمے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سیاسی حالات بالکل پر امن تھے اور انگریز اردو کی ترویج چاہتے تھے ملاحظہ فرمائیں:

"۱۸۸۴ء میں جب الفرڈ لائل سابق لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی رامپور تشریف لائے تو انھوں نے نواب کلب علی خان سے فرمایا کہ اگر اردو زبان کی ایک جمع لغت آپ کی وساطت سے تیار ہو جائے تو بہت بڑا کام ہو گا۔ نواب صاحب نے منشی صاحب سے فرمایا، منشی صاحب کو اس کا پہلے سے ہی خیال تھا۔ حسب الارشاد ۱۸۸۶ء میں لفظ "آنکھ" کے متعلق تمام محاورات وغیرہ لکھ کر نمونتاً لیفٹیننٹ بہادر کی خدمت میں روانہ کیے۔ لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے ان اوراق کو پسند فرمایا، اور یہ وعدہ کیا کہ اس میں پوری مدد کی جائے گی اور اس کے لیے بڑا چندہ جمع کیا جائے گا کہ جس سے علاوہ اخراجات طبع مؤلف کی بھی محنت کا پورا صلہ مل جائے"(۲)

درج بالا اقتباس میں مولوی عبدالحق نے الفرڈ لائل کی علم دوستی کو نمایاں کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ انگریزوں کو مسلمانوں کی زبان اردو کی ترویج سے کس قدر دل چسپی تھی۔ اس خاکے میں عبدالحق کے مطابق اردو کی جتنی بھی عمدہ لغات اس وقت موجود ہیں وہ یا تو خود انگریزوں کی لکھی ہوئی ہیں یا پھر ان کی تحریک سے لکھی گئی ہیں۔ پروفیسر حیرت مرزا کی شخصیت کے بیان میں مولوی عبدالحق نے معاشرے میں رشوت اور اقرباء پروری کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ اس وقت کے ایرانی معاشرے میں بھی اہم اور کلیدی عہدوں کے حصول کے لیے ایک بھاری رقم شاہ کو نذرانے کے طور پر دینا پڑتی اور پھر اس کا کئی گنا عوام سے وصول کی جاتی تھی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"سترہ سال کی عمر میں صوبہ گیلان کی صوبہ داری (گورنری) نذر کی گئی مرزا حیرت نے اسے قبول نہیں کیا کیونکہ ایران میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی اعلیٰ عہدہ کے لیے منتخب کیا جاتا تو اس شاہی خزانے میں ایک متعدبہ رقم داخل کرنا پڑتی اور جب وہ اپنی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے تو خوب ہاتھ رنگتا ہے، اور جتنا دیتا ہے اس سے بیس گنا وصول کر لیتا ہے۔"(۳)

سیّد محمود کے خاکے میں بھی سیاسی اور سماجی عنصر موجود ہے سیّد محمود بھی اپنے والد کی طرح مسلمانوں کی ترقی کی لیے تعلیم کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعمیر و ترقی میں وہ والد کے شانہ بشانہ نظر آئے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"کالج کے قائم کرنے اور اس کی اسکیم تیار کرنے میں وہ شروع سے اپنے والد کے مؤیّد اور معین تھے اور خصوصاً کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال سیّد محمود کے دل میں

پیدا ہوا، اور سب سے اوّل اس کی اسکیم انھوں نے ہی پیش کی۔ وہ ہمیشہ کالج کی امداد کرتے رہے اور دل کھول کے کی۔ سر سید احمد خان اپنی اور سید محمود کی ان رقوم کا کبھی حساب نہیں رکھتے تھے جو مدرسے کی اعانت میں انھوں نے وقتاً فوقتاً دیں اس لیے ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن کچھ شک نہیں کہ علاوہ قلمی امداد کے مالی امداد بھی انھوں بہت کچھ دی۔ جو معاملات گورنمٹ اور کالج کے مابین یا کالج اور یورپین پروفیسروں کے متعلق ہوتے وہ ہمیشہ مرحوم کے سپرد کیے جاتے تھے۔"(۴)

سر سید نے سید محمود کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی اور جب وہ ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس لوٹے تو لارڈ لٹن جس کے سر سید سے خصوصی تعلقات تھے اور وہ سر سید کی تعلیمی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس نے سید محمود کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر کر دیا۔ مولوی عبد الحق نے سید محمود کے خاکے میں ان کی جو تصویر پیش کی اس بدولت ہر کوئی ان کی فیاضی اور اخلاق کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ ان کی زندگی کا حصہ نہ تھا۔ مولوی عبد الحق لکھتے ہیں کہ:

"وہ اپنی روزانہ ضروریات یعنی کھانا پینا، سونا، لباس وغیرہ جس پر ہم لوگوں کا بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ صرف ہوتا ہے کچھ پروانہ کرتا اور بے تکلف سی سادہ زندگی بسر کرتا جس میں نہ نئے فیشن کو دخل تھا اور نہ پرانی وضع کا زور چلتا تھا، مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پروا تھا اسی قدر وہ اخلاق میں مُستثنیٰ تھا۔ ایک اجنبی سا اجنبی شخص بھی جب اس سے ملتا تو اس کی وسعتِ اخلاق سے اس قدر خوش ہوتا جتنا وہ اپنے عمر بھر کے گہرے دوست اور بے تکلف یار سے مل کر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اخلاق، فیّاضی اور بے تکلفی کی وجہ سے ادنی اور اعلی ہر طبقہ اور ہر ملّت کے لوگوں میں مقبول تھا۔"(۵)

مولوی چراغ علی کے خاکے میں مصنف نے محنت کو ہی سماج میں کامیابی کی کلید قرار دیا ہے جو لوگ سخت محنت کے عادی ہوتے ہیں کامیابی ان ہی کا مقدر ہوتی ہے۔ مولوی چراغ علی اپنی محنت اور لیاقت سے اعلی رتبہ تک پہنچے۔ مذکورہ خاکے میں ہی مولوی عبد الحق نے ایسٹ انڈیا کے نمائندوں کی انفرادی خوبیوں اور خامیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عوامی کاموں کی ستائش بھی کی ہے۔ لارڈ ڈلہوزی کو ذہین، محنتی، جفاکش اور مستقل مزاج بتایا ہے لیکن اس کے دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کرنے اور کمپنی میں ضم کرنے کے اقدام کو بُرا بھی کہا ہے۔ مولوی عبد الحق نے انگریزوں کے طرزِ حکمرانی کی تعریف و توصیف کی ہے

جبکہ مقامی حکمران رنجیت سنگھ اور سکھّوں کی کج فہمی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ رانی میں اتنی قوت اور دور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور ناعاقبت لوگوں میں پڑ کر ملک کی حالت اور بگاڑ دی جس کے نتیجہ میں سکھ ایک اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔"(۶)

سکھوں سے حکومت چھن جانے کے بعد انگریزوں کے حکومتی اقدامات کی وجہ سے مقامی لوگوں میں انگریزوں کے خلاف بہت نفرت پیدا ہوئی اور سکھوں اور انگریزوں کے درمیان اتنی خون ریز جنگیں ہوئیں کہ انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ تو انگریز حکومت کی بنیاد جڑ سے ہل گئی۔ مولوی چراغ علی کے خاکے میں جاپان کے سیاسی اور معاشی استحکام کی وجوہ کو بیان کیا گیا ہے اور سر سالار جنگ اوّل کی تدابیر اور جاپان کی بیداری کا موازنہ بھی کیا ہے جاپان میں ان تدابیر کی کامیابی اور اور ہندوستان میں ان کی ناکامی کی وجہ کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے ملک کی اصلاح اور ترقی کی لیے جو تدابیر اختیار کی تھیں بعینہ وہی تدابیر اس دور بیں اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کیا ور باہر سے قابل، تجربہ کار اور شائستہ لوگوں کو بُلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کر لیا، پرانی خرابیوں کی اصلاح کی، نئے نئے دفاتر قائم کیے اور ان کو صحیح اصولوں پر چلایا، ملک کے ذرائع پر غور کیا اور آمدنی کو بڑھایا، تعلیم کو رونق دی، تہذیب اور شائستگی پھیلائی اور گورنمنٹ کو خاصا مہذب اور شائستہ بنادیا لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ ملک وہی کا وہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اہل جاپان میں حب وطنی بہت زیادہ تھی اور ہر جاپانی اس شَد ومَد اور جوش سے کیا کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی پر پڑنے والا ہے۔ اور ہر شخص کی دلی آرزو یہ تھی اور اسی خیال سے محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بیٹھادے اور طرفۃ العین میں اسے عروس الممالک بنادے۔ برخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب وخیال سے بھی کوسوں دور ہیں۔"(۷)

مولوی چراغ علی لوگوں سے گھبراتے تھے۔ اگر کوئی ان سے ملنے آ ہی جاتا تو کام کے علاوہ کوئی

دوسری بات نہ کرتے اور چاہتے کہ ملاقات جلد سے جلد ختم ہو۔ اگر کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تو بہت غصّے ہوتے۔ بہت کم بولنے والے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ مولوی عبد الحق نے سماج میں مولوی چراغ علی کے کردار کو اس طرح بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"حیدرآباد میں جہاں کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح سے رہے جیسے طوفانِ موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالاں کہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش، کسی پولٹیکل، سوشل تحریک میں ان کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصّبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کی توجہ اور دل کہیں اور تھا۔[۸]

مولوی عُزیر مرزا کی خاکہ نگاری میں ان کی سرکاری امور کی انجام دہی کو مولوی عبد الحق کچھ اس طور بیان کیا ہے کہ ان کے کام سے سرکار کے ساتھ رعایا بھی بہت خوش تھی وہ اپنے کام کو انتہائی دیانت داری اور دل چسپی سے انجام دیتے۔ مولوی عبد الحق، مولوی عُزیر مرزا کی اس خصوصیت کا بیان سُنیے:

"اپنے فرض منصبی کو اس خوبی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری روپورٹوں میں متواتر ان کی کارگزاری پر اظہارِ خوشنودی کیا گیا اور اِدھر رعایا اس قدر خوش تھی کہ ہندو مسلمان ان کے تبادلے پر آنسو بہاتے تھے۔ اس کے بعد وہ مجلسِ عالیہ عدالت کے رُکن (جج ہائی کورٹ) ہوئے اور باوجودیکہ انھوں نے کوئی قانونی امتحان پاس کیا ہی نہیں تھا لیکن یہاں بھی وہ اپنے کام میں ممتاز رہے۔ تعلیم یافتہ شخص کے یہی خوبی ہے کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اسے حسن وخوبی سے ادا کرے۔"[۹]

وسعتِ قلبی، خوش اخلاقی اور انصاف پسندی وہ خوبیاں ہیں جو کسی بھی شخصیت کو سماج میں مقبول تر بناتی ہے۔ مولوی عبد الحق نے مولوی عُزیر مرزا کو ان تمام خوبیوں کا مُرقع بتایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"دوسری بات جس نے مرحوم کو خاص وعام، امیر غریب، ادنی واعلی سب میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا ان کی وسعتِ اخلاق تھی۔۔ ہر کی بات کو سُنتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، نخوت اور رعونت چھو نہیں گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے آدمی کے

ساتھ بھی مساوات کا برتاؤ کرتے۔ ان کا گھر پبلک کا گھر تھا اور صبح کے ۶ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔"(۱۰)

مولوی عبدالحق نے عُزیر مرزا کی سیاسی سرگرمیوں کو ان کے خاکے میں بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح انھوں مسلم لیگ کو زندہ اور فعال کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ لکھتے ہیں کہ:

"حیدر آباد سے جانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ان کے سکریٹری ہونے سے پہلے لیگ برائے نام تھی۔ مرحوم نے اس کو زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے اس کے دائرہ افادہ کو وسیع کیا اور اہلِ کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پر زور آلہ ثابت ہوتے۔"(۱۱)

شمس العلماء مولوی سیّد علی بلگرامی کے خاکے میں خاندان سادات کی قدردانی کا بیان ملتا ہے۔ اہل سندھ سیّد کی بہت قدر کرتے تھے لیکن اگر کوئی سیّد بھی انگریزوں کا طرف دار نظر آتا تو اس سے بھی شدید نفرت کرنے لگتے تھے۔ مولوی عبدالحق اہل سندھ کے سیّد علی بلگرامی کے متعلق روّیے کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

"جب اہل سندھ کو معلوم ہوا کہ یہ سیّد ہیں تو ان کے بنگلہ پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے،اور بیماروں کے لیے تعویذ مانگنے آتے تھے۔۔ انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تا کہ لوگ بدگمان نہ ہو جائیں، مگر بدگمانی سے بچ نہ سکے چوں کہ بہت وجیہہ، گورے چٹّے تھے۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ دراصل یہ انگریز ہے لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اس لیے وہاں برہمی ہو گئی۔ یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انھیں بھی اس کی اطلاع ہو گئی اور یہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔"(۱۲)

مولوی عبدالحق نے سیّد علی بلگرامی کے خاکے میں دکن کے ماحول کی طوائف الملوکی اور انتشار کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا ہی رہتا یعنی دکن کی فضا علمی و ادبی کاموں کے لیے ساز گار نہ تھی۔ سیّد علی بلگرامی ایسے لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے جو علمی شغف رکھتے تھے۔ اور سماج کے دوسرے لوگوں پر

خواہ وہ کتنے ہی بااثر کیوں نہ ہو ہمیشہ ان کو دوسروں پر ترجیح دیتے مثال ملاحظہ فرمائیں:

"مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی ان سے ملنے آ جاتا تو اس سے ملنے میں کبھی عُذر نہ کرتے، خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اسی اثنا میں کوئی بڑا آدمی آ جاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چُھڑا لیتے تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب صاحبِ علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ وقارُالامراء بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر تشریف لائے ہیں۔۔اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کرو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی طرف سے ترک نہیں کر سکتا۔اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ہی ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمایئے۔اس گفتگو سے فارغ ہو کر ملوں گا۔"(۱۳)

قومیں اپنی ثقافت اور اور فکر سے دوسری قوموں کو متاثر کرتی ہیں۔ کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم کی تہذیب و ثقافت سے اتنی متاثر ہوتی ہے کہ اپنا تشخص تک کو کھو بیٹھتی ہے۔ خصوصاً غالب اقوام مغلوب اقوام کی تہذیب و ثقافت پر ہی حملہ آور ہوتی ہیں۔خواجہ غلام الثقلین کی مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق نے ان کی اس قومی خدمت کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق خواجہ صاحب کو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغہ اصلاحِ تمدن کا انچارج بنایا گیا۔اس فریضہ کو انھوں نے کس قدر خوبی سے انجام دیا۔مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"اصلاحِ تمدن کا صیغہ ان کے سپرد ہوا۔انھوں نے اس فرض کو جس مُستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سکریٹری بھی ان سے نامور لوگ تھے لیکن جیسا اصلاحِ تمدن کا صیغہ چمکا وہ بات کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی انھوں نے پرچے 'عصرِ جدید' کے ذریعے سے اصلاحِ تمدن پر بڑے بڑے پُرزور مضمون خود لکھے اور دوسرے سے لکھوائے اور اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لیکچر دیے اور تقریریں کیں اور مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت کی ہلچل پیدا کر دی۔"(۱۴)

"گدڑی کا لال-نور خان " کے خاکے میں انگریزوں کے ان معیارات کا ذکر ہیں جو مقامی لوگوں کو انگریزی افواج میں بھرتی کے لیے مقرر تھے۔ان میعارات میں نسل، صحت اور جنگ جویانہ صلاحیتیں شامل

تھیں۔ ان معیارات کو مولوی عبد الحق نے نور خان کے خاکے میں یوں بیان کیا ہے۔

"حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات حسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب جا کر کہیں ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ کی جاتی تھی کہ صرف شُرفاء اس میں بھرتی کیے جائیں یہی وجہ تھی کہ کنٹنجنٹ والے عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔"(۱۵)

مولوی عبد الحق نے نور خان کی انفرادی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے اس کی فرض شناسی اور سچائی جیسے ان اوصاف کو کو بیان کیا ہے۔ نور خان کی اوّل رسالہ میں اہمیت کا اندازہ درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے ان سے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ انھیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی۔ خان صاحب کسی کی ترچھی نظر کے روادار نہ تھے، انھوں نے فوراً رپورٹ کر دی۔ لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے۔ مگر خان صاحب نے ایک نہ سُنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خان صاحب سے معافی مانگے۔ ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔"(۱۶)

مہمانوں کی خدمت اور آؤ بھگت ہندوستانی معاشرے کی خوبی ہے مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ نور خان کے خاکے میں ہندوستانی معاشرے کی اس خوبی کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

"ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھہر جاتے، ان کی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے کہ ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے

تھے۔"(۱۷)

مولوی عبدالحق نور خاں کے خاکے میں انگریزوں کی جانب سے اپنے وفادار لوگوں کو نوازنے کی جھلک بھی دکھاتے ہیں۔ اور ایسے لگتا ہے کہ وہ عام ہندوستانی کے دل میں انگریزوں کی محبت پیدا کر رہے ہیں ۔نور خان پر انگریز افسران کی عنایات کی جھلک ملاحظہ فرمائیں۔ "کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انھیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں۔"(۱۸)

مولوی عبدالحق کی سیاسی و سماجی فکر ان کی خاکہ نگاری کا اہم جزو ہے۔ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں بیان کردہ شخصیات سے وابستہ سیاسی اور سماجی واقعات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق تحریک علی گڑھ سے منسلک رہے۔ آپ کو سیاست اور سماج کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلم لیگ سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی رہنمائی کا کام علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے ہی ہوتا رہا۔ اسی تحریک کی بدولت مسلمان سیاسی اور سماجی طور پر طاقت ور ہوئے اور یوں اگلی منزل کا تعیّن ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے خاکوں میں انگریزوں کی علم دوستی کا ذکر کیا اور سماج میں رشوت اور اقربا پروری کی جھلک دکھائی۔ سر سیّد اور ان کے بیٹے کی سیاسی اور سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ محنت کی عظمت کو اُجاگر کر کے محنت کرنے کی ترغیب دی۔ سلطنتوں کے عروج و زوال اور معاشی و سیاسی استحکام کو بیان کیا۔ آپ نے اصلاحِ تمدن کے لیے کی جانے والی کوششوں کو بیان کیا اور اردو ہندی تنازعہ کو بھی پیش کیا۔ مجموعی طور پر مولوی عبدالحق نے اپنی خاکہ نگاری میں جس طرح سیاست اور سماج کو بیان کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آنے والے لوگوں کو اپنی خاکہ نگاری کے ذریعے اس وقت کے سیاسی و سماجی حالات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول میں وہ بہت کامیاب رہے۔

علمی و ادبی فکر

برصغیر میں مسلمانوں کے لیے شروع ہونے والی تحریکیں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا معاشرتی، علمی و ادبی ہوں یا سیاسی سب کا سرچشمہ سر سیّد احمد خان ہی تھے۔ مولوی عبدالحق نے نے بھی تحریک علی گڑھ کی کوکھ سے ہی جنم لیا تھا اس لیے ان کی فکر میں درج بالا عناصر کا موجود ہونا لازمی امر تھا۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں علم و ادب، سیاست و معاشرت اور مذہب کی جھلکیاں واضح نظر آتی ہیں۔ مولوی عبدالحق سر سیّد کے فیض یافتہ تھے اور جو وسعت اور جامعیت سر سیّد کے ہاں موجود تھی اس کا اثر مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں بھی نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" میں جن لوگوں کے خاکے بیان ہوئے ہیں ان میں کثیر

تعداد علم وادب سے وابستہ لوگوں کی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے جہاں شخصیت کے عادات واطوار کو بیان کیاہے وہاں شخصیات سے منسلک علمی وادبی سرگرمیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا یہ پہلو ان کی علمی و ادبی فکر کا عکاس ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے معاصرین کی علم دوستی کے بیان میں "منشی امیر احمد صاحب" کا ذکر کرتے ہے کہ کس طرح منشی امیر احمد نے مختلف علوم پر دسترس حاصل کی وہ لکھتے ہیں کہ:

> "عربی فارسی کی کتابیں علمائے وقت کی خدمت میں پڑھیں، علاوہ اس کی طب، نجوم وغیرہ میں بھی مہارت حاصل بہم پہنچائی مگر ذوقِ شعر غالب تھا۔ تدبیر الدولہ مظفر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر اسیر امیٹھوی امین صدر امانت نصیر حیدر شاہ ومیر منشی امجد علی شاہ وواجد علی شاہ سے تلمّذ اختیار کیا۔ اور اس رنگ کی شاعری کو اپنے استاد سے زیادہ فروغ دیا۔ بِلاشبہ منشی صاحب مرحوم فخر اسیّر تھے۔"(۱۹)

مولوی عبدالحق نے منشی امیر احمد صاحب کی کی دو شرحوں 'ارشادالسلطان' اور ہدایۃ السلطان' کی طرف توجہ دلائی ہے جو غالباً بادشاہ کے کلام کی شرحیں تھیں۔ مولوی عبدالحق نے منشی امیر احمد کی خوبیوں کو کرتے ہوئے بتایاہے کہ منشی امیر احمد اسیّرؔ کے شاگرد تھے اور چونکہ اسیّرؔ کو مصحفی سے تلمذ تھا اس لیے اسیّرؔ کے کلام میں مشکل پسندی پائی جاتی ہے لیکن منشی امیر احمد کلام صاف اور عمدہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "انکے بعض اشعار بہت صاف اور عمدہ نکل گئے ہیں۔ منشی صاحب کا اخیر کلام اور بھی صاف ہو گیااور بھونڈے استعارات کے کے لچھے بہت کم نظر آتے ہیں"(۲۰)

مولوی عبدالحق نے نے منشی امیر احمد کی مرقع نگاری میں ان کی دوسری اصناف جیسے قصائد، ترجیع بند، ترکیب بند اور واسوخت کی بھی تعریف کی ہے اس کے علاوہ ان کے نعتیہ رسائل کا بھی ذکر کیاہے۔ 'محامد خاتم النبین، ذکرِ شاہ انبیا، صبحِ ازل، شامِ ابد ان ان کی مشہور نعتیہ نظمیں ہیں۔ مولوی صاحب نے منشی صاحب کی 'امیر اللغات' کا بھی ذکر کیاہے جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے کیونکہ اس وقت اردو زبان کی کوئی جامع لغت نہ تھی۔ منشی امیر کی 'امیر اللغات' کی دو جلدیں چھپیں، جن میں صرف (الف) کا بیان تھا۔ تیسری جلد میں (ب) کا بیان تھا لیکن وہ چھپ نہ سکی اور منشی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

مولوی عبدالحق نے پروفیسر حیرت مرزا کے خاکے میں آپ کی علمی خدمات کو کچھ یوں بیان کیاہے کہ حیرت مرزا کا علم وسیع اور حافظہ بہت ہی قوّی تھا۔ حافظے کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا کہ حافظؔ اور سعدیؔ کی

تصانیف بھی اگر دنیا سے مٹ جائیں تو حیرت مرزا اپنے حافظے کے زور پر بلا کم وکاست ان کو دوبارہ پیدا کر سکتے ہیں۔ پروفیسر حیرت مرزا کے خاکے میں ان کے بطور مترجم کام کو سراہا گیا ہے۔ پروفیسر حیرت مرزا نے گورنمنٹ کی درخواست پر سر جان ملکم کی "تاریخِ ایران" کا فارسی ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں آپ کا طرزِ تحریر و خیال انگریزی تھا مگر بحیثیت ایک فارسی کتاب کے بڑے سے بڑا نقاد حرف گیری کی جرات نہیں کر سکتا تھا تصنیف و تالیف میں بہت آزادی ہوتی ہے لیکن ترجمہ میں مصنف کے قدم بہ قدم چلنا پڑتا ہے۔ "تاریخِ ایران" کے ترجمے پر حیرت مرزا پر اپنے ہم وطنوں کی طرف سے خاصی تنقید بھی ہوئی اس ضمن میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

> "اس کتاب کے لیے مترجم کو اپنے ہم وطنوں سے بہت کچھ لعن طعن اور بُرا بھلا سُننا پڑا۔ زیادہ تر اس لیے کہ انھوں نے مصنف کے خیالات حتی کہ ان نقائص کو بھی صحیح صحیح بیان کر دیا ہے۔ ایران میں اگرچہ بحیثیت انشاپردازی کے اس کتاب کی بہت تعریف ہوئی مگر پہلے پہل اس سے سخت مخالفت اور نفرت کی گئی مگر اب وہ تعصب بہت کم ہو گیا بلکہ جاتا رہا۔ اگرچہ یہ کتاب صرف ایک ترجمہ ہے لیکن اس دنیا میں اس نامور فاضل کی ایک یادگار رہے گی۔"[۲۱]

پروفیسر حیرت مرزا کو عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور تھا انھوں نے فلسفہ، منطق، نجوم اور طب کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا تھا۔ وہ عمر بھر مختلف مذاہب کے علم اور مذہبی صداقت کی جستجو میں رہے۔ مولوی چراغ علی کے خاکے میں بھی جو بات مولوی عبدالحق کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ ان کی علمی قابلیت ہے۔ چراغ علی نے معمولی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور پھر صرف اپنی محنت اور لیاقت کے بل بوتے پر اعلی مرتبے تک پہنچے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھرپور محنت کی۔ انھوں نے باقاعدہ کوئی امتحان پاس نہیں کیا بس مطالعہ کتب ان کا شوق تھا۔ مولوی چراغ علی نے اپنے اسی علمی وادبی ذوق کی بدولت عمادالدین جو کہ ایک پادری کی کتاب 'تاریخِ محمدی' کے جواب میں 'رسالہ تعلیقات' لکھا۔ اس کے علاوہ منشورِ محمدی اور مخبرِ صادق میں بھی مولوی چراغ علی کے اکثر مضامین شائع ہوتے رہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق چراغ علی جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہہ تک پہنچ جاتے وہ اپنی کتاب کے لیے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر کے دفتر چھان ڈالتے۔ مولوی چراغ علی کی وفات پر سر سیّد نے ان کے متعلق لکھا کہ:

"متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے اور بولتے تھے۔ عربی اور کلڈی زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدرِ کار روائی جانتے تھے۔ اعلا درجے کے مصنف تھے، انگریزی زبان میں بھی انھوں نے تصنیفیں کی ہیں۔"(۲۲)

مولوی چراغ علی کی انگریزی کتب پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے زبردست ریویو لکھے۔ انگلستان کے مشہور اخبار "اے تھی نیم" نے مولوی چراغ علی کی انگریزی کو قابل قدر قرار دیا۔ "بمبئی گزٹ" جو بمبئی پریسڈنسی کا ایک قابلِ قدر اخبار تھا، نے مولوی چراغ علی کی کتاب کو عمدہ قرار دیا۔ جرنل آف دی انجمن پنجاب نے اپنے ریویو میں لکھا کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع و مذہب کا بہت بڑا عالم ہے۔"(۲۳)

مولوی چراغ علی ہر وقت مطالعے اور غور و فکر میں مصروف رہتے تھے وہ عام لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ عبدالحق نے ان کے اس علمی و ادبی ذوق کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"مطالعہ کا بے حد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے چلے جاتے تھے اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے، اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔۔۔ تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو ضرور جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صَرف ہوتا تھا۔"(۲۴)

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی کی شخصیت نگاری میں ان کی علمی بصیرت کا بیان ہے۔ آپ نے آٹھ سال کی عمر سے چودہ سال کی عمر کو پہنچنے تک علومِ عربیہ حاصل کیے۔ ان کا حافظہ بھی کمال کا تھا جو چیز ایک دفعہ نظروں سے گزری وہ کبھی نہ بھولی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کر لیا۔ کالج کے مُدرس اور پروفیسر آپ کی ذہانت و قابلیت اور حافظے کے معترف تھے۔ مولوی عبدالحق سیّد علی بلگرامی کی علمی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی،

عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے۔۔ اور ویدوں اور ویدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کیے۔ میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سُنا ہے کہ ان کا تلفُظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی پنڈت پڑھ رہا ہے۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہ جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلا تکلف پڑھتے چلے جاتے تھے۔"(۲۵)

مرحوم کی تالیفات و تراجم کی تفصیل جو ان خاکے میں بیان ہوئی ہے اُس کے مطابق مڈیکل جورسپروڈنس یعنی اصول و قوانین متعلق بہ طب، رسالہ در تحقیقِ تالیفِ کتاب کلیلہ ودمنہ، فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بہ مقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ، غار ہائے الورہ گائڈ، موسیولیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ، تمدنِ ہند وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین کی خاکہ نگاری میں ان کی علمی اور ادبی خدمات پیش کی گئی ہیں۔ ان کا ایک پرچہ 'عصرِ جدید' ہے جس میں انھوں نے اصلاح تمدن پر بڑے پُرزور مضامین خود بھی لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لیکچر بھی دیے اور تقریریں بھی کیں۔ اور مسلمانوں میں اصلاح تمدن کی ایک ہلچل پیدا کر دی۔ خواجہ غلام الثقلین کے عملی ذوق و شوق کو ان کے خاکے میں یوں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"خواجہ صاحب کا ذوق علمی تھا۔۔ لیکن چونکہ پہلی سی فرصت نہ تھی، اس لیے مطالعہ کی وہ شان باقی نہ رہی مگر وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے، قلم ان کا آخری دم تک نہ رکا اور وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے 'عصرِ جدید' کو دوبارہ زندہ کیا۔ مگر افسوس اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔"(۲۶)

الطاف حسین حالی اردو ادب کے رجحان ساز ادیبوں میں شامل ہیں۔ مرزا غالب، مصطفٰی خاں شفیتہ، سر سیّد، حسین آزاد، مرزا داغ، نذیر احمد اور اکبر الٰہ آبادی جیسے لوگ ان کے معاصرین میں شامل تھے۔ مولوی عبدالحق نے ان خاکے میں ان واقعات اور خدمات کو خصوصیت سے جگہ دی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا تھا، بورڈنگ ہاؤس میں ہی رہا۔ اکثر مغرب کے

کچھ دیر بعد کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں 'حیاتِ جاوید' کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ 'یادگارِ غالب' بھی ترتیب دے رہے تھے۔"(۲۷)

مولانا حالی نے سر سیّد کی تعلیمی تحریک کی تائید کی اور جہالت کی تاریکی کو دور کرنے اور معاشرتی و معاشی اصلاح کے معاملے میں سر سیّد کے ہم نوّا رہے۔ مولانا حالی نے شعر و ادب سے حقیقی زندگی کی ترجمانی کر کے اس کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ مولوی عبد الحق نے مولانا حالی کے خاکے میں اس بات کا انکشاف کیا کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی زبان اردو کی ترویج کے لیے سنسکرت اور برج بھاشا سے نفرت کرنا چھوڑ دیں اور ان زبانوں کو سیکھیں۔ مولانا حالی کے مطابق جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اس کو سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے عربی فارسی سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بِنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مُستفاد ہے، قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بڑا حصّہ اسماء کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی اور فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمّل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔"(۲۸)

مولوی عبد الحق نے حالی کے ذوقِ شعر کا ذکر کرتے ہوئے 'حیاتِ سعدی' "یادگارِ غالب' اور مقدمہ شعر و شاعری کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حالی علمی کاوشوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ جب بھی کوئی اچھی تحریر نظروں سے گزرتی تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ "پیسہ" اخبار جب روزانہ ہوا تو آپ ہی نے خوش ہو کر سب سے پہلے مبارک باد کا تار دیا۔ مولانا ظفر کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف

میں نظم لکھی۔ "ہمدرد" اور مولانا محمد علی کی مداح سرائی کی۔ مولانا حالی نے مولانا آزاد اور شبلی کی کتابوں پر تبصرے لکھیں۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیر ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے ان میں طبع آزمائی کی۔ برکھارُت، حبِ وطن اور نشاط اُمید اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا حالی کے خاکے میں ان کی درج بالا علمی خدمات کے علاوہ ان کی چھوڑی ہوئی پبلک لائبریری کا بیان بھی ہے جس میں کافی بڑی تعداد میں کتابیں موجود تھیں اور پانی پت کے لوگ اب تک اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" کے خاکوں میں اپنے معاصرین کی مرقع نگاری میں ان کی علم و ادب کے لیے خدمات کا ذکر کر کے دراصل اپنی علم و ادب سے محبت اور فکر کا اظہار کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بیان کی گئی شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کے ذکر سے ان کی خاموش تصویروں میں زندگی کی رمق ڈال دی۔ مولوی عبدالحق اردو ادب میں ہونے والے تغیرات اور انقلابات کے عینی شاہد تھے۔ انہی تغیرات اور انقلابات کی ایک جھلک انھوں نے اپنے خاکوں میں دکھائی ہے۔ دراصل وہ وہ چاہتے تھے کہ آنے والی نئی نسل اپنے ادیبوں اور شاعروں کے علمی کارناموں اور سچّی علمی لگن سے آگاہ رہے اور علم و ادب ترقی کی جانب مائل رہے۔

مذہبی فکر

مولوی عبدالحق کے خاکوں میں مذہبی فکر کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ آپ نے خاکوں میں مذہبی روّیوں کا ذکر کرتے ہوئے مذہبی نظریات کو بھی قاری کے سامنے لایا۔ آپ نے ان شخصیات کی ان خدمات کا ذکر بھی کیا جو مذہب کی ترویج و ترقی کا ذریعہ بنی۔ تحریکِ علی گڑھ کی مسلمانوں کے لیے سیاسی، سماجی، علمی و ادبی خدمات ڈھکی چھپی نہیں۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی مذہب کے حوالے سے بھی بہت خدمت کی۔ تحریک علی گڑھ کا مزاج مذہبی حوالے سے معتدل تھا۔ یہی اثرات ہمیں مولوی عبدالحق کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں تشدد کا عنصر بالکل نہیں ملتا۔ مذہبی تعصب کی کوئی جھلک ہمیں دکھائی نہیں دیتی ہاں مذہبی رواداری ضرور نظر آتی ہے۔ ادیب اور شعراء مذہب اور مذہبی فکر کو پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنے افکار و نظریات کے پرچار سے ایک پُر امن معاشرہ تشکیل دیں اور چاہے تو معاشرے میں فساد بپا کر دیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی خاکہ نگاری سے مذہب کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے اور ایسے خیالات و نظریات کے پرچار سے گریز کیا ہے جو معاشرے کو انتشار میں مُبتلا کرنے کا باعث بنے۔ مولوی عبدالحق نے پروفیسر حیرت مرزا کے خاکے میں انھیں ایک متقی، جھوٹ سے نفرت کرنے

والا اور در گزر کرنے والا انسان دکھایا ہے۔ پروفیسر حیرت مرزا کو دینی علوم سے بہت زیادہ دل چسپی تھی اور وہ مختلف مذاہب کی حقانیت کو پانے کے لیے سرگرمِ عمل رہے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ "انھیں خاص دل چسپی دینیات سے تھی اور آخر دم تک وہ دنیا کے تمام مذاہب کی جستجو میں سرگرم رہے۔"(۲۹)

مولوی چراغ علی کے خاکے میں ان کے مذہبی رجحان کا ذکر ہے۔ عیسائیوں کے اسلام پر جو اعتراضات اُٹھائے مولوی چراغ نے ان کا مدلّل جواب دیا۔ آپ نے اسلام کی حقانیت کو ظاہر کیا۔ اس خاکے میں اس بات کا بھی بیان ہے کہ مولوی چراغ علی نے سرسیّد کے جاری کردہ رسالے "تہذیب الاخلاق" میں بھی کچھ مضامین لکھے۔ اس رسالے کا مقصد مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور قومیت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ مولوی چراغ کو مذہبی تعصّب اور فرقہ بندی سے نفرت تھی۔ اس بے تعصبی میں مولوی عبدالحق یوں بیان کرتے ہیں:

> "نہایت بے تعصّب تھے اور کسی مذہب وملّت سے انھیں خصومت اور پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے چناں چہ گزشتہ مردم شماری سے پہلے جو مردم شماری ہوئی تو انھوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھ دیا لیکن اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام فرقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔"(۳۰)

مولوی چراغ علی کے خاکے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کچھ خطوط کا بھی ذکر ہیں جو اُس نے مولوی صاحب کو لکھے اور اپنی کتاب "براہینِ احمدیہ" کی تالیف میں مدد طلب کی۔ اس سلسلے میں مرزا غلام احمد قادیانی آپ کی منت سماجت کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اُس کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں:

> "آپ کے مضمون اثباتِ نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی ہے پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا، اس لیے مکرّر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایتِ بزرگانہ بہت جلد مضمونِ اثباتِ حقانیتِ فرقانِ مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصّے پر مشتمل ہیں تصنیف کی ہیں اور اس کا نام براہینِ احمدیہ علٰی حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبواۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے

فوائد و جرائد بھی اس میں درج کروں۔"[۳۱]

یہاں کچھ خطوط کا ذکر بھی ہے جن کے مطابق مرزا غلام احمد نے مولوی چراغ علی کو ہندوؤں کی "وید" پر سخت قسم کے اعتراضات اُٹھانے کے لیے مواد کی فراہمی کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ قران کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے تحقیقی دلائل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ خطوط ثبوت ہیں کہ مولوی چراغ علی کو حمایت و حفاظتِ اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ آپ نے مولوی احمد حسن کی کتاب "تاویل القرآن" کی اشاعت پر سو روپے مصنف کی خدمت کے طور پر بھیجے۔ مولوی چراغ علی نے مولوی محمد علی کی کتاب "پیغامِ محمدی" کی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔ شمسُ العلما ڈاکٹر سید محمد علی بلگرامی کے خاکے میں مولوی عبدالحق نے اُن کی بے تعصبی اور اسلام سے محبت کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق آپ کے اہل و عیال کا تعلق ایک شیعہ مسلک سے تھا۔ مگر وہ اس تفریق کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا کُتب خانہ بہت وسیع تھا مگر لیکن اس میں شعیہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ خاکے میں مولوی سیّد علی کے رام پور کے نواب کے ساتھ مکالمے کا ذکر ہے جس میں نواب نے سیّد صاحب کو محمد باقر مجلسی کی کتاب "بحارُ الانوار" کو اپنے کتب خانے کی زینت کے بارے میں بتایا۔ مولوی سیّد علی نے مذہبی کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

> "شیعوں کی مذہبی کتابیں محض بے کار ہیں اور ہر گز قابلِ استدلال نہیں۔ جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جن کے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی، اسقاط و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو مُلا باقر کی کتاب کس شُمار میں ہے" نواب نے فرمایا کہ "اور کچھ نہیں تو اہل بیت نبوی کے فضائل جو سُنیوں نے خصوصاً بُخاری و مسلم کے جامعین نے قلم انداز کیے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔" مرحوم نے کہا" یہ بھی ایک مُہمل بات ہے نبی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کے لیے۔ ایک معمولی تمیز دار آدمی بھی اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلافِ آداب سمجھتا ہے، نبی کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا۔ ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلافِ قیاس ہے۔"[۳۲]

سیّد علی بلگرامی کے اس خاکے میں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ایرانی عالم سے ان کے مذہبی مباحثے کا ذکر ہے جس میں انھوں نے دلائل کی طاقت سے اُسے لاجواب کیا۔ اس مباحثہ کا احوال ملاحظہ فرمائیں:

"میں نے پوچھا۔ "تم حضرت عمر سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟" ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علی کی پیروی کرتے ہیں۔" اس پر میں نے کہا کہ "حضرت عمر اور حضرت علی میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عدوات ہوتی جیسا آپ خیال کرتے ہیں تو وہ اپنی بیٹی اُمِ کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے نہ کرتے۔" ایرانی نے تعجب سے پوچھا ۔"اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے" مرحوم نے اپنے کتب خانے سے فوراً تاریخِ یعقوبی مصنفہ ابنِ واضح کاتب عباسی جو کہ شعیہ مذہب کا عالم ہے لا کر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہے اور اس کے دیباچہ میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی اس کتاب اور واقعہ کو دیکھ کر تائب ہو گیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی حضرت عمر کو بُرا نہیں کہوں گا اور تعجب ہے کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو چھپاتے کیوں ہیں۔"[۳۳]

مولوی سیّد علی بلگرامی کو مذہبی کتابوں کے بہت مداح تھے۔ اور مذہبی نسخے خریدنے میں بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ مولوی سیّد علی متعصب نہ تھے اور وسیع مشرب رکھتے تھے۔ اپنی رائے کا ہمیشہ کھل کر اظہار کرتے۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مرحوم ' صحیح بخاری کے بڑے مدّاح اور قدر دان تھے اور کہتے تھے کہ عربی سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثناخواں تھے۔"[۳۴]

محسن الملک کی خاکہ نگاری میں میں مولوی عبدالحق نے ان حالات وواقعات کی طرف اشارہ کیا جن میں مذہب کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مسلمانانِ برصغیر معاشرتی و معاشی لحاظ سے زوال کا شکار تھے۔ مایوسی کے اس عالم میں مذہب ہی ان کی آخری امید تھی۔ مذہب پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ مولوی عبدالحق نے جناب محسن الملک کے خاکے میں مسلمان ادیبوں کی مذہب سے وابستگی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اس وقت شاید ہی کوئی مسلمان ادیب یا مصنف ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے ہیں اور اپنے خیال میں بد مذہب اور بدعقیدہ سمجھتے تھے ان کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا۔"[۳۵]

نواب محسن الملک کے مذہبی لگاؤ کا ذکر کچھ اس طرح ہے "وہ میلاد پڑھتے اور واعظ کہتے تھے۔ نیچری ہونے پر لیکچر اور مضامین لکھنے لگے۔"[۳۶] مولوی عبدالحق نے اپنی مذہبی فکر کا اظہار اپنے سب سے مشہور خاکہ "نام دیو- مالی میں بھی کیا ہے۔ آپ نے نیکی کو غالب قرار دیا ہے۔ آپ نیکی کی صلاحیت کو ہی کامیابی کا زینہ

سمجھتے ہیں۔ درجہ کمال کو پانے کے لیے دولت اور دوسرے ذرائع اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ انسان کو امر ہونے اور خدا کے ہاں سرخرو ہونے کے لیے عبادات کی بجائے معاملات کو درست کرنا ہو گا۔ نام دیو کی اس خوبی کو مولوی عبدالحق نے اس خاکے میں کچھ اس طرح اُجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ کو ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلقِ اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔"(۳۷)

مولوی عبدالحق نے صلاحیتوں کے بہترین استعمال کو ہی نیکی قرار دیا ہے۔ نام دیو کے خاکے میں اس کی محنت اور کام کرنے کی دُھن کو دوسری تمام نیکیوں سے افضل قرار دیا ہے۔ محنت اور دیانت داری کا درس ہمارے مذہب کا دیا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے جن ہم عصروں کی مرقع نگاری کی ہے۔ ان کے مذہبی رجحان، خیالات و نظریات اور ان کی مذہبی خدمات کو پوری دیانت داری سے بیان کر دیا ہے۔ ایک خاکہ نگار کا یہ فرض ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا، سُنا یا اسے جو معلومات ملیں ان کو بیان کر دے۔ شخصیات کے بیان میں مذہب کو شامل کرنا دراصل مذہبی فکر کی پیشکش ہے۔ ایک مصنف، ادیب یا خاکہ نگار اپنی تحریروں ان ہی واقعات کو جگہ دیتا ہے جن سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے بیان کردہ واقعات ان کی مذہبی رواداری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے خیالات متشدد نہ تھے۔ فرقہ بندی ان کو پسند نہ تھی۔ دوسروں کو سُننے اور برداشت کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ دین کو پنپتا اور ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

ب۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری جائزہ

شاہد احمد نے اپنے مجموعے "گنجینہ گوہر" میں شخصیات کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے ان کی زندگی کے سیاسی و سماجی، علمی و ادبی اور اور مذہبی پہلوؤں کو خاص طور پر سامنے رکھا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے ان پہلوؤں

پر روشنی ڈالتے ہوئے خود کو غیر جانب دار ضرور رکھا ہو گا لیکن شاہد احمد ایک مصنف اور ادیب ہونے کے ساتھ ایک انسان بھی تھے۔ شاہد احمد کا سیاست اور سماج کے متعلق اپنا بھی کوئی نقطہ نظر ہو گا۔ علم و ادب اور مذہب کے بارے آپ کے افکار دوسروں سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ شخصیات کے بیان میں سیاست اور سماج، علم وادب اور مذہب کے واقعات کو شامل کرتے ہوئے ان واقعات کو ضرور شامل کیا گیا ہو گا جو مصنف کی اپنی فکر سے قریب ہوں گے۔ سماج کا بیان تو شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں خوب تفصیل سے ہے۔ آپ نے سماجی و معاشرتی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے اور شخصیات کے مزاج، مسائل، دکھ درد ان کے تفکرات اور رجحانات کو بھی بیان کیا ہے۔ شخصیات سے منسلک سیاسی معاملات کی جھلک کو بھی شاہد احمد دہلوی نے اپنے منفرد انداز میں دکھایا ہے۔ یہاں ہم "گنجینہ گوہر" کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی کی سماجی و سیاسی، علمی و ادبی اور مذہبی فکر کا مختصر جائزہ لیں گے۔

سماجی و سیاسی فکر

شاہد احمد دہلوی اپنی خاکہ نگاری میں بڑے دل چسپ انداز میں پہلے سماج کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر سیاست کی جھلکیوں کو شامل کر کے موضوعِ خاکہ کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کے خاکہ میں اس وقت کے ان سماجی مسائل کا ذکر موجود ہے جو غریب طلباء کو درپیش ہوتے تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز مسجد تھی اور مسجد میں طلباء سے مولوی صاحبان کیسا سلوک روا رکھتے تھے اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "مولوی صاحب بڑے فخر سے اپنے بچپن کے مصائب کو بیان کرتے تھے۔ جس مسجد میں ٹھہرے تھے اس کا مُلّا بڑا بدمزاج اور بے رحم تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں ایک ٹاٹ کی صف میں یہ لپٹ جاتے اور ایک میں ان کے بھائی۔ سات آٹھ سال کے بچے کی بساط ہی کیا؟ علی الصباح اگر آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا مُلّا ایک لات رسید کرتا اور وہ لڑھکتے چلے جاتے اور صف بچھ جاتی۔ اس زمانے کے طالب علموں کی طرح انہیں بھی محلّے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانی پڑتی تھی۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے۔"(۳۸)

شاہد احمد دہلوی نے مولوی نذیر احمد کی خود داری کو بھی بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان کے سسرال کافی خوشحال تھے لیکن تنگدستی کے باوجود شادی کے بعد وہ اپنے سسرال کے ساتھ نہیں رہے۔ مالی تنگی کو بیان

کرتے ہوئے شاہد احمد نے لکھا کہ "میں نے بڑی بوڑھیوں سے سُنا ہے کہ ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی۔ کبھی بیوی ان لیتروں کو ہلگا لیتیں کبھی میاں"(۳۹) مولوی نذیر احمد کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے دہلی کی قدیم عمارتوں کا دل کش نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی تزئین و آرائش اور بناوٹ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "ڈیوڑھی کے آگے صحن میں سے گزر کر دالان میں گئے یہاں دو تین آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ پچھلے دالان کے دروں میں کیواڑوں کی جوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں جن کے اوپر رنگ برنگ شیشوں کے بستے بنے ہوئے تھے۔ یہ تین دروازے تھے جو کُھلے ہوئے تھے اور ایک دائیں جانب کا بند تھا اس کمرے نما دالان میں ہم ابّا کے ساتھ داخل ہوئے۔"(۴۰)

اپنے دادا مولوی نذیر احمد کے خاکے میں شاہد احمد نے ان کے انگریز حکمرانوں سے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔ ٹامسن صاحب (شمال مغربی صوبے کے لفٹیننٹ گورنر) مولوی نذیر احمد کے بہت بڑے قدردان تھے شاہد احمد ان سے ملاقات کا تذکرہ بڑے دل آویز انداز میں کیا ہے اور ساتھ ہی رشوت جیسی معاشرتی بُرائی کا ذکر بھی کیا ہے جو ہندوستانی معاشرے کا جزو بن چکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> "ٹامسن صاحب (شمال مغربی صوبے کے لفٹیننٹ گورنر) مولوی صاحب کے بڑے قدردان دوست تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع پا کر مولوی صاحب ان سے ملنے گئے۔ چپڑاسی نے ایک مُلّا شکل کے کالے آدمی کو دیکھا تو کوٹھی کے دروازے پر روک لیا۔ مولوی صاحب نے لاکھ چاہا کہ تعارفی کارڈ صاحب تک پہنچادے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پرانے ملنے والے ہیں مگر وہ بھلا کیوں گردانتا؟ آخر ہار کر مولوی صاحب نے دو روپے بٹوے سے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا "بھائی اب تولِ للہ پہنچادے۔" یہی تو وہ چاہتا تھا۔ جھٹ کارڈ لے کر اندر گیا اور طلبی ہو گئی۔"(۴۱)

میر ناصر علی کے خاکے میں شاہد احمد نے جن واقعات کو بیان کیا ہے اس سے ہمیں ان سماجی قدروں اور روّیوں کا پتہ چلتا ہے جو اُس وقت مروّج تھیں میر ناصر علی کے خاکے میں ان کی اپنی بیوی سے والہانہ محبت کا ذکر ہے۔ اس بیان سے میاں اور بیوی کے مضبوط سماجی رشتے کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ میر ناصر کی بیوی سے محبت کو بیان کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"میر صاحب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ ہر سال اپنی شادی کی سال گرہ منایا کرتے تھے۔ تیسرے پہر گھر والے اور قریبی عزیز جمع ہونے شروع ہوتے۔ کھان پان ہوتا۔ بیوی دلہن بنتیں، مہمانوں کے ہالے میں آکر بیٹھتیں اور میر صاحب انھیں سونے کی انگوٹھی پہناتے۔ مبارک سلامت کا شور مچتا، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں ۔اور ایک ایک کر کے رات گئے تک مہمان رخصت ہوتے۔ بیوی کے انتقال کے بعد میر صاحب پچیس سال جیے مگر انھوں نے دوسری شادی نہ کی۔"(۴۲)

میر ناصر کی مرقع نگاری میں شاہد احمد دلّی کی پُر وقار تعمیرات کا عکس قاری کے سامنے لاتے ہے ۔کشادہ دالان اور کوٹھڑیوں کا بیان قاری کو ماضی کے دریچوں کی سیّر کرواتا ہے۔ میر ناصر علی کے خاکے میں شاہد احمد اُن کی حویلی کا منظر یوں بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"میر صاحب کی حویلی—حویلی کاہے کو محل سرا کہنا چاہیے—کے تین حصّے تھے۔ زنانہ جس میں کشادہ دلان در دلان، مغل محرابوں والے، ان پر پٹا پٹی کے رُوئی بھرے دبیز پردے پڑے ہوئے۔ دالانوں میں دائیں بائیں کوٹھڑیاں تھیں۔ پیش دالان کے سامنے چبوترہ منچیاں۔ نیچے کے رخ ڈائیں جانب ایک سہ دری تھی جس میں کیواڑ لگا کر کمرہ بنالیا تھا۔۔۔ مکان کے اس حصّے میں میر صاحب کا کُتب خانہ اور نوادر خانہ تھا۔ زنانہ خانہ اور کتب خانہ کی پوری لمبان میں بازار کے رخ ایک چوڑی پٹی پر مردانہ بنا ہوا تھا۔ نیچے بازار کے رخ دکانیں اور محلسرا کا مغلئ شاندار صدر دروازہ تھا۔ جس کے بڑے بھاری کیواڑوں میں پتیلی گنج کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک پٹ میں کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ڈیوڑھی تھی جس میں ایک بڑے سے تخت پر دربان بیٹھا رہتا تھا۔"(۴۳)

میر ناصر کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے دلّی میں بپا ہونے والی تقریبات کا ذکر کرتے ہوئے قدیم ہندی ثقافت کی منظر نگاری کی ہے۔ شاہد احمد نے "شبِ ماہ" کی منظر نگاری کچھ اس طرح سے کی ہیں کہ خاکہ پڑھنے والا خود کو اس تقریب میں بیٹھا اور لُطف اندوز ہوتا محسوس کرتا ہے۔ اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے اور کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جاتی تھی۔ "شب ماہ" کی تصویر کشی دراصل شاہد احمد کی دلّی ثقافت سے محبت اور فکر کی عکاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شبِ ماہ" چودھویں کے چاند میں منائی جاتی تھی۔ اس میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ

جہاں تک ممکن ہو ہر چیز سفید ہو۔ چنانچہ دھوپ ڈھلتے ہی چھڑکاؤ کیا جاتا۔ شام ہو تے ہوتے اُجلی اُجلی چاندنیوں کا فرش ہو جاتا ۔چاروں طرف گاؤ تکیے لگ جاتے چنگیروں میں چنبیلی کے اور موتیا کے پھول رکھے جاتے۔ ادھر چاند کھیت کر تا اُدھر مہمان سفید بُراق انگرکھے دربر اور سفید دوپلّیاں بر سر آنے شروع ہو جاتے اور تکیوں کے سہارے بیٹھنا شروع ہو جاتے اور پیچوانوں سے خمیر کی لپٹیں اٹھتی رہتیں، چاندی کی تھالیوں میں گنگا جمنی ڈبیاں رکھی ہوتیں۔ بڑی ڈبیا میں پان، اس سے چھوٹی میں چھالیا، اس سے چھوٹی ڈبیوں میں کسی میں چوگھڑا الائچیاں، کسی میں زردے کی ننھی ننھی گولیاں ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئی سفید بلور کے آب دانوں میں برف پڑی ہوئی، ان کر گرد گلاس سجے ہوئے۔۔ دلّی کے چیدہ چیدہ اہلِ کمال بلائے جاتے تھے۔ ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے۔ سب اپنا اپنا منتخب کلام سُناتے اور خاطر خواہ داد پاتے۔"(۴۴)

میر ناصر کے خاکے میں ان کے انگریز افسران سے تعلق اور خوشامد کا ذکر بھی ہے۔ وہ ترقی کے لیے اس کو ضروری خیال کرتے تھے۔ لیکن شاہد احمد کے مطابق انھوں نے انگریزی حکومت سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بشیر الدین احمد، شاہد احمد دہلوی کے والد محترم ہیں۔ اپنے والد کی سماجی زندگی کے بیان سے شاہد احمد نے اپنی سماجی فکر کو اُجاگر کیا ہیں۔ مذکورہ خاکے میں شاہد احمد نے روزگار کے حصول کے معاشرتی مسئلے کی کو بخوبی بیان کیا ہے۔ فارغ التحصیل لوگوں کے لیے اس وقت بھی روزگار کا حصول ایک بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن محنتی اور قابل لوگ اپنی قابلیت اور لیاقت کی بدولت کسی نہ کسی مقام پر پہنچ ہی جاتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی اپنے دادا مولوی نذیر احمد کی معاشی تگ ودو کا ذکر کیا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

"دلّی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نذیر احمد کچھ دنوں تک بیکار رہے۔ انہیں بڑا تاؤ آیا۔ ایک پرنسپل سے جا کر بھِڑ گئے۔ پرنسپل نے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو ؟" بولے "جھک مار رہا ہوں۔ اُپلوں کا ٹال لگانے کا ارادہ ہے۔ اس پر دلّی کی سند لگاؤں گا تا کہ سب کو معلوم ہو جائے دلّ کالج میں تعلیم پانے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ انہیں پہلے مُدرسی اور اس کے بعد اسکول انسپکٹری مل گئی۔ یہی زمانہ تھا کہ ان کے ہاں اولاد ہونا شروع ہوئی، اور خدا کے فضل سے ایسی بھگوان اولاد ہوئی کہ دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرتے چلے گئے۔ ڈپٹی کلکٹر بنے اور ڈپٹی صاحب کہلائے۔"(۴۵)

مولوی بشیر الدین بھی اپنے والد کی طرح محنتی مزاج رکھتے تھے۔ان کے معمولات زندگی سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک نفیس طبع انسان تھے۔شاہد احمد نے اپنے والد کے کھانے پینے اور لباس کی بہت ستائش کی ہیں ۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابّا بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا۔اچھے سے اچھا باورچی رکھتے۔اور عمدہ سے عمدہ کھانے پکواتے۔لباس کے بھی بہت شوقین تھے۔دیسی اور ولایتی سبھی قسم کے کپڑے تھے اور اتنے زیادہ کہ ان کو پہننے کی باری بھی نہیں آتی تھی۔ایک زمانے میں انگرکھا بھی پہنا کرتے تھے۔ "(۴۶)

شاہد احمد نے مولوی بشیر الدین کے خاکے میں شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی تقاریب اور اس بابت اپنے والد صاحب کا نقطہ نظر کو بڑے مفصل انداز سے بیان کرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ:"دادا ابّا خاصے کٹّر مولوی تھے،وہ دین کے آگے دنیا کی پروا نہیں کرتے تھے۔ابّا دین اور دنیا دونوں رکھتے تھے۔"(۴۷)بشیر الدین احمد کی سماجی زندگی کا عکس ملاحظہ فرمائیں:

"تھیٹر اور سینما دیکھتے اور ہمیں بھی دکھاتے۔ہماری شادیوں میں برات کے ساتھ بینڈ باجا تو نہیں بجا لیکن دو دو تین تین دن تک مشہور طوائفوں کے ناچ گانے اور بھانڈوں کے مُجرے اور نقالوں کی نقلیں ہوتی تھیں۔یہ محفلیں مخصوص تھیں اور اُن میں صرف شرفاء کو مدعو کیا جاتا جنہیں اس فن کا ذوق ہوتا۔ان محفلوں میں بیلیں نہیں دی جاتی تھیں اور نہ ہی کوئی بے ہودگی روا رکھی جاتی۔"(۴۸)

مولوی عنایت اللہ کی مرقع نگاری میں شاہد احمد دہلوی نے اُس وقت کی حکومتی لوٹ کھسوٹ کا ذکر کیا ہے۔حکومت رئیسوں سے نذرانے وصول کرتی تھی۔اور نتیجتاً وہ غریب عوام کی کھال اُدھیڑ دیتے تھے۔ظلم و جبر کی اس داستاں کو شاہد احمد دہلوی یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"خود اعلیٰ حضرت کو روپیہ جمع کرنے کا ہَوکا ہو گیا ہے۔دورے کرتے ہیں پائیگاہوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھکڑے بھر بھر کے سونا چاندی کے لاتے ہیں۔ رئیسوں میں مسابقت ہو رہی ہے۔۔چنانچہ اعلیٰ حضرت پہلے دس لاکھ والے سے دس لاکھ وصول کرتے ہیں اور پھر گیارہ لاکھ والے سے گیارہ لاکھ اس طرح گویا دونوں کو خوش کر دیتے ہیں۔یہ روپیہ کیسے جمع کیا جاتا ہے؟رئیس اپنے تعلقداروں سے کہتا ہے

کہ دس لاکھ جمع کرو۔ تعلق دار تحصیل داروں سے کہتے ہیں، تحصیل دار پٹواریوں سے کہتے ہیں اور پٹواری عوام کی کھال ادھیڑتے ہیں۔"(۴۹)

حکومتی لوٹ مار کی بدولت معاشی بدحالی عروج پر تھی کیوں کہ تاجر جو ملکی معیشت کا پہیہ چلاتے ہیں انھوں نے بازاروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کی وجہ حکومت کی بے جا مداخلت تھی۔ تاجروں کی عدم دل چسپی کی وجوہات ملاحظہ فرمائیں کہ:

"بازاروں میں سودا بیچنے والوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا کہ اعلیٰ حضرت من مانی قیمت پر ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے۔ جس دکان یا ہراج خانے میں گھستے تہلکہ مچ جاتا۔ ہزار روپے کی چیز دس روپے میں لے جاتے اور ان دس روپوؤں کو بھی دکاندار جھنیکتا پھرتا۔ نیلام میں سب سے پہلے بولی سرکار خود لگا دیتے۔ کس کی ماں نے دھونسا کھایا ہے کہ بڑھ کر بولی لگائے۔"(۵۰)

شاہد احمد دہلوی نے مولانا عنایت اللہ کے خاکے میں دلّی کے آلودہ ماحول کو بیان کیا ہے۔ افراطِ آبادی کی وجہ سے دلّی کی گلیاں بہت تنگ ہو گئی تھیں۔ محلے گند سے اٹّے ہوئے تھے اور ہر طرف شور ہی شور تھا۔ اس آلودہ ماحول سے اُکتا کر مولانا عنایت اللہ دہرہ دُون چلے گئے۔ منٹو کی خاکہ نگاری میں شاہد احمد نے منٹو کے سماجی روّیوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ منٹو کو اپنی صلاحیتوں پر بڑا ناز تھا۔ منٹو اپنے آپ کو ہی سب کچھ سمجھتا تھا۔ بات بات پر اڑی لگا لیتا تھا۔ اس کی وجہ شاید اس کی بیماری تھی جس کی تشخیص نہ ہو سکی تھی۔ منٹو کو تصنّع اور بناوٹ سے چڑ تھی۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک ہی تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا کہہ دیتا چراغ حسن حسرت اور منٹو کی ٹکر کا ذکر بھی شاہد احمد دہلوی نے منٹو کے خاکے میں کیا ہے ۔ شاہد احمد کے مطابق منٹو ایک حساس طبعیت کا مالک تھا اور اس کے مزاج میں آنے والی اکھڑ اور دُرشتی معاشرے کے روّیوں کی بدولت تھی۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"دنیا نے اسے بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا۔ بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کر بگڑا دوست ،احباب ،کنبہ،رشتہ دار سب سے اسے تکلیفیں پہنچی تھیں۔ اس لیے اس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ مگر اس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی۔"(۵۱)

منٹو معاشی تنگی کا شکار رہتا تھا مگر خودداری اس کے اندر خوب کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ شاہد احمد

دہلوی نے شعراء اور ادیبوں کی کثرت سے شراب نوشی کو بھی منٹو کے خاکے میں بیان کیا ہے۔ منٹو کو بھی داد و تحسین کا جو کچھ ملتا شراب کی نظر کر دیتا۔ اپنی سیاسی فکر کے تناظر میں جوش ملیح آبادی کی شخصیت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے شاہد احمد نے ان کی نظام حیدر آباد سے مخاصمت کا ذکر کیا ہے۔ نظام حیدر آباد میر عثمان علی خان نے جوشؔ کی ایک نظم کو جواز بنا کر ان کی ملک بدری کا پروانہ جاری کر دیا۔ حقیقت میں میر عثمان علی اپنے بیٹے معظم جاہ کی حرکتوں سے نالاں تھا لیکن اپنی پدری شفقت سے مجبور تھا۔ معظم جاہ کے دربار میں جوشؔ کا عمل دخل حد سے زیادہ تھا۔ شاہد احمد دہلوی اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

> "نظام کے منجھلے شہزادے معظم جاہ کے شبینہ دربار میں جوشؔ کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سن کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ شرؔ کا دربارِ حرام پور اس کے آگے گرد تھا۔ جوشؔ اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدر آباد کے ثقہ راویوں سے سُنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کُل حاضر باش ننگے ہو کر ناچنے لگتے تھے، اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔۔۔ ان تمام بیہودگیوں کی اطلاع عالیجاہ کو پہنچتی رہتی تھی مگر وہ شفقتِ پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چنانچہ 'طوطے کی بلّا بندر کے سر' جوشؔ پر نزلہ گرانے کا انھیں بہانہ ہاتھ آ گیا۔ (۵۲)

جوشؔ کی خاکہ نگاری میں شاہد احمد نے شعراء اور ادیبوں کی باہمی رقابت کا ذکر بھی کیا ہے۔ جوشؔ مقابلہ بازی نہیں کرتے تھے۔ مگر فراقؔ جوشؔ کو اپنا حریف گردانتے تھے۔ جوشؔ اور فراقؔ کے جھگڑے میں تاثیرؔ کی شرارتی کردار کا ذکر بھی ہے۔ معاملات ہمیشہ شرارتی لوگوں کی وجہ سے ہی بگڑتے ہیں۔ اگر تاثیرؔ اور دوسرے احباب معاملات کو ٹھنڈا کرتے تو لڑائی کی نوبت نہ آتی۔ لڑائی کا احوال کا شاہد احمد یوں بیان کرتے ہیں:

> " جوشؔ اور فراقؔ میں چلنی شروع ہوئی، پہلے مذاق ہی مذاق میں پھر نشہ زدہ سنجیدگی کے ساتھ۔ حاضرین میں سے کچھ جوشؔ کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراقؔ کے ساتھ۔ فراقؔ کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیزم تازی گالی گلوچ تک پہنچی۔ اس میں ذرا کمی آئی تو تاثیر کبھی جوشؔ کو شہ دیتا اور کبھی فراقؔ کو۔۔ مگر جب

فراقؔ نے بیٹی کی گالی دی تو جوشؔ کے تیور بگڑ گئے۔ "(۵۳)

جوشؔ ملیح آبادی شراب کے رسیّا تھے۔ جس میں محفل میں جوشؔ ہوتے وہاں شراب ضرور ہوتی۔ دوست احباب بھی اس معاملے میں ان کا بہت خیال رکھتے۔ "انجمن دانشورانِ ادب" کے صدر ایک علم دوست شخصیت تھے۔ وہ مہینے دو مہینے میں ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام کرتے تھے کبھی کبھی اس میں جوشؔ بھی شریک ہوتے تھے۔ میزبان جوشؔ صاحب کی قدر دانی اور ناز برداری کس طرح کرتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

> "شیخ صاحب ان کے قدر دان اور ناز بردار تھے۔ اس لیے ان کے لیے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔۔۔ مہمان آتے جاتے ہیں اور بیٹھے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوشؔ صاحب کی میز الگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ شراب کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برف کی ڈلیاں ہیں۔ دو گلاس ہیں۔ ایک ٹائم پیس بھی میز پر رکھی ہوئی ہے۔ کیوں کہ جوشؔ صاحب گھڑی رکھ کر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا شراب کا دور ختم ہوا۔ مجازؔ مرحوم کو بھی جوشؔ صاحب نے نصیحت کی تھی کہ میاں گھڑی رکھ کر پیا کرو۔ اس بلانوش نے جواب میں کہا تھا کہ "میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیئوں۔ "(۵۴)

شاہد احمد نے اپنی خاکہ نگاری میں سماج کے رسم ورواج، طرزِ معاشرت اور معاشرے کے نادار طبقوں کا احوال سُنایا ہے۔ اس کے علاوہ دلّی کی قدیم عمارات ان کی بناوٹ اور خوب صورتی کی بھی دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ قاری ان عمارات کے بیان کو پڑھتے ہوئے ان کی سیّر کا لطف محسوس کرتا ہے۔ شاہد احمد نے ادبی محافل، ان کے انعقاد کی تیاریوں کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ ہندو مسلم دوستانہ تعلقات کا تذکرہ بھی ہے اور معاشرے کے متموّل لوگوں کے طرزِ زندگی کو بھی اپنی خاکہ نگاری میں جگہ دی ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات اور رسموں کا ذکر بھی ہے اور حکمران طبقے کے ادبی ذوق اور مقامی لوگوں سے برتاؤ کا بیان بھی ہے۔ شاہد احمد نے ایسے حکومتی اقدامات کا ذکر بھی کیا ہے جن سے رعایا نالاں تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے ان تمام واقعات کو اپنی خاکہ نگاری میں شامل کر کے سیاست اور سماج کے متعلق اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔

علمی و ادبی فکر

شاہد احمد دہلوی علمی و ادبی میدان میں اپنے باپ اور دادا کے سچّے جانشین ثابت ہوئے وہ نہ صرف خود صاحبِ طرز ادیب تھے بلکہ "ساقی" کا اجراء کر کے دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی ادیب بنایا۔ شاہد احمد کی

تربیت علمی ادبی ماحول میں ہوئی۔ اسی علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کے لیے شاہد احمد دہلوی نے دوستوں کے مشورے اور تعاون سے ماہنامہ "ساقی" جنوری ۱۹۳۰ء میں جاری کیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں کتابوں کی اشاعت کا کاروبار شروع کیا اور اس مقصد کے لیے "ساقی بک ڈپو" کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں "مہتمم رسالہ ساقی" کے پلیٹ فارم سے ناصر نذیر فراق کے مضامین "چار چاند" اور افضل حسین چشتی کے سائنسی افسانے "یدِ قدرت" کے نام سے چھپے۔ بعد میں "ساقی بک ڈپو" کے تحت ڈراموں، افسانوں اور تراجم کی اشاعت ہوتی رہی۔ شاہد احمد "ساقی" کے علاوہ "رسالہ شاہجہاں" اور "کامران" جو دہلی سے شائع ہوتے رہے ان کے بھی مدیر رہے۔ تقسیمِ ہند اور شاہد احمد کی ہجرتِ پاکستان کے بعد شاہد احمد نے کراچی آکر دوبارہ "ساقی" کا اجراء کیا۔ کراچی ہی میں شاہد احمد ریڈیو سے منسلک ہوئے اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف اور ترجمہ نگاری بھی کرتے رہے۔ شاہد احمد دہلوی نے ادبی جرائد کے مسائل کے حل کے لیے "انجمن ادبی جرائد" اور پاکستان میں ادیبوں اور شاعروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے "رائٹرز گلڈ" کی تشکیل آپ کا کردار اہم نوعیت کا تھا۔

شاہد احمد دہلوی کی علم اور ادب سے وابستگی کی یہی جھلک ہمیں ان کی خاکہ نگاری میں موجزن ہے۔ آپ نے جن شخصیات کے خاکے لکھے، ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھرپور ذکر کیا۔ علم و ادب کی ترویج و ترقی ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ اس لیے وہ قارئین کو شعراء اور ادباء کی کوششوں سے روشناس کرانے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہد احمد کی یہ تمام کوششیں ان کی علمی و ادبی فکر کی عکاس ہیں۔ استاد بیخودؔ دہلوی کے خاکہ میں شاہد احمد دہلوی نے ان کی علم تشنگی کو بیان کیا ہے اور ان کے والد کے ایک پُرانے دوست کے سرمایہ کتب سے استفادہ کے واقعے کو بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> "وصی اشرف صاحب سے بیخودؔ صاحب کا دوگونہ تعلق تھا۔ ایک تو ان کے والد کے تقدس کی وجہ سے اور دوسرا انکے سرمایہ کتب کے باعث بیخودؔ صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وصی اشرف نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گٹھیا سے گٹھیا سارے ہی ناول چٹا دیے۔ مگر بیخودؔ صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "میاں اس میں مزا نہیں آیا۔ کوئی اور دو۔ اور وصی اشرف دلّی کے جوتے والوں کی طرح روز اُنہیں ایک توفہ (تحفہ) ناول دیتے اور وہ اسے اپنے بڑے سے لکھی رومال میں لپیٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے۔"(۵۵)

استاد بیخودؔ دہلوی غزل گو شاعر بھی تھے۔ لیکن مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی جگہ غزل پڑھنا پڑتی تو اپنے ایک خوش آواز شاگرد سے پڑھواتے تھے۔ بیخودؔ کے خاکے میں ایک سرکاری مشاعرے کا ذکر ہے جس میں بیخودؔ نے خود غزل پڑھی اور خوب داد سمیٹی۔ شاہد احمد دہلوی اس واقعہ کو کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بیخودؔ کا کڑاکا سُنائی دیا اور انہوں نے اپنے شعر تحت اللّفظ میں پڑھنے شروع کر دیے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ شور ختم ہوتا تو داد کا شور بلند ہوتا۔ سبحان اللہ! غزل کا تو ان کی جواب ہی نہ تھا۔ مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا۔"(۵۶)

شاہد احمد دہلوی نے استاد بیخودؔ دہلوی کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ انھوں نے "دیوان غالب" کی شرح بھی لکھی تھی۔ خواجہ حسن نظامی کی شخصیت نگاری میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ "ادب میں اپنے زمانے کا بڑا ادیب کہلایا۔ علومِ دینی میں وہ بصیرت حاصل کی کہ فرنگی حکومت نے شمسُ العلماء کا خطاب دیا۔"(۵۷)

خواجہ حسن نظامی کے دل میں ایک بڑا آدمی بننے کی تمنّا تھی۔ اس مقصد کے پانے کے لیے آپ نے دلّی کے چوکوں اور گلیوں میں تعلیم حاصل کی اور تجربہ حاصل کیا۔ خواجہ حسن نے پھیری پر کتابیں اور اخباریں تک بیچیں۔ خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات کا ذکر شاہد احمد نے ان کے خاکہ میں یوں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خواجہ صاحب نے اپنے سینکڑوں ہی اخبار جاری کیے۔ روزانہ ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ۔ یہ سب پرچے شہابِ ثاقب کی طرح مطلعِ صحافت پر نمودار ہوتے۔ اپنی خیرہ کن چمک دمک دکھاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گھل جاتے۔ ان کا اخبار "منادی" صرف ایک ایسا پرچہ ہے جو بیسیوں چولے بدلنے پر بھی شائع ہوتا رہا۔"(۵۸)

خواجہ صاحب کے خاکے میں ایک متموّل اور آسودہ حال صاحب محمد ارتضٰی کا ذکر بھی ہے جن کو ادب سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کے تعلق داروں میں علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری جیسے ادیب شامل تھے۔ ارتضٰی صاحب نے کئی رسالے بھی نکالے ان میں ایک رسالہ "درویش" بہت مشہور بھی ہوا۔ شاہد احمد دہلوی ارتضٰی کی ادبی خدمات کو یوں بیان کیا کہ:

"خواجہ صاحب نے جب حلقہ مشائخ نواب بُڈھن کے کمرے پر قائم کیا تو "نظام

المشائخ" کے نام سے محمد ارتضٰی صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔اس پرچہ میں جہاں اہلِ سلوک کے مسائل پر مضامین ہوتے تھے وہاں اعلٰی درجہ کے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔خواجہ صاحب نے اس زمانے میں بہت اچھے اچھے مضامین لکھے۔محمد ارتضٰی کو خواجہ صاحب نے "مُلا واحدی "کا خطاب دیاجو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو تو سب جانتے ہیں اور محمد ارتضٰی کو کوئی نہیں جانتا واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بڑے بڑے کام کیے۔"(۵۹)

خواجہ حسن نظامی نے ایک اخبار "رعیت "بھی جاری کیا تھا۔رعیت کی ایڈیٹری خواجہ صاحب نے دیوان سنگھ کے سپرد کی تھی۔خواجہ صاحب کی مطبوعات تین طرح کی تھیں وہ جو خواجہ صاحب نے خود لکھیں ، دوسری وہ جو خواجہ صاحب نے لکھوائی یا ترجمہ کرائیں اور اصل مصنف کے نام سے شائع ہوئیں، تیسری وہ کتابیں ہیں جن کو خواجہ صاحب نے اپنے طرزِ تحریر میں لکھوایااور وہ پھر ان کے ہی نام سے منسوب ہو گئیں۔ خواجہ صاحب کے خاکہ میں ان کے "ترجمہ قرآن ہندی"کا بھی تذکرہ ہے۔خاکہ نگار نے میرآجی کے خاکے میں "نیرنگ خیال" اور ادبی دنیا کے رسائل کا ذکر کیاہے۔"ادبی دنیا" کی ادارت میرآجی کے پاس تھی۔شاہد احمد نے میرآجی کی شاعری کو عجوبہ قرار دیاہے اور ساتھ ہی اس بات کو تسلیم بھی کیا کہ میراجی کی شاعری کو سمجھ نہیں آتی تھی لیکن شاہد احمد نے میراجی کی شاعری کو پُرکشش قرار دیاہے۔میراجی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔شاہد احمد نے میراجی کی نثر کی تعریف یوں کی کہ: "ان کی نثر میں بلا کی دل کشی تھی۔مشرق کے شاعروں اور مغرب کے شاعروں پر انہوں نے سلسلے وار مضامین لکھے تھے اور سب کے سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔"(۶۰)

میرآجی نے جب ریڈیو میں ملازمت اختیار کی تو شاہد احمد دہلوی کی ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں اور شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" میں ان کی نظمیں اور مضامین شائع ہونے لگے میرآجی کی ریڈیو کے لئے خدمات کو بیان کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی کہتے ہیں کہ:

"ریڈیو کے مسودات لکھنے میں میراجی کو کافی مہارت ہوگئی تھی اور حسبِ ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔گیت ریڈیو میں ہی آکر لکھے اور اتنے کہ ان کا مجموعہ "گیت ہی گیت "کے نام سے شائع ہوا۔نثر میں بھی صاحب طرز تھے۔انداز فکر فلسفیانہ اور طرز بیان انشاء پردازنہ تھا۔نظمیں جب کہنے پر آتے تھے تو کئی کئی کہہ لیتے تھے۔مگر

خدا جانے کب کہتے تھے اور کس کیفیت میں کہتے تھے ۔چند نظمیں خود ان سے سمجھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی غزلیں بھی کہی ہے اور بہت ستھری۔"(۶۱)

منٹوؔ کے خاکے میں شاہد احمد نے منٹو کی علمی ذوق و شوق کو بیان کیا ہے۔ خاکہ کے شروع شاہد احمد دہلوی نے دلّی ریڈیو اسٹیشن کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ساری علمی و ادبی شخصیات جمع ہو گئی تھیں۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"دلّی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرتؔ ،اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروگرام کے شعبے میں ن-م-راشد، انصار ناصری محمود نظامی اور کرشن چندر۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹوؔ اور میرا جیتے تھے۔ اس زمانے میں منٹوؔ کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا"(۶۲)

شاہد احمد کے مطابق منٹوؔ نے اپنی آمدنی سے دو ٹائپ رائٹر خریدے ایک انگریزی اور دوسرا اردو کا اور یہ دونوں وہ روزانہ ریڈیو اسٹیشن لاتا تھا۔ کام کی دُھن منٹوؔ میں اس قدر زیادہ تھی کہ وہ ذمہ سے زیادہ کرنے کا خواہش مند ہوتا تھا۔ شاہد احمد دہلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹوؔ کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ—"لو" یہ رہا تمہارا فیچر! منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی جچی تلی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی اس میں گنجائش نہ ہوتی۔"(۶۳)

دلّی آمد کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں منٹو نے افسانہ نگاری کا ایک اُچھوتا انداز اپنایا۔ ان نئے اور اُچھوتے افسانوں کو شاہد احمد دہلوی نے 'ساقی' کی زینت بنایا وہ لکھتے ہیں کہ:

"دلّی آمد کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دور جدید شروع ہوا۔ انھوں نے طبع زاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کیے۔ "ساقی" کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا" دھواں" اسی ریلے میں لکھا گیا۔ اور اس کی اشاعت پر دلّی

کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا بھائی، ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ برا ہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹوؔ سے اس کا ذکر کیا حسبِ عادت بہت بگڑا مگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔"(۶۴)

شاہد احمد دہلوی نے مرزا محمد سعید کی علم و ادب کی ترقی اور فروغ کے لئے کی گئی کوششوں کو سراہا ہے مرزا محمد سعید نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز سر عبدالقادر کے رسالہ" مخزن" میں مضامین لکھ کر کیا۔ مرزا محمد سعید پیسے کے حصول کے لیے نہیں لکھتے تھے۔ ان کو اس کی بالکل پرواہ نہ ہوتی تھی بلکہ اگر کوئی اس طرح کی بات کرتا تو وہ چڑ جاتے تھے۔ لاہور کے پبلشروں نے کتابیں لکھوانے کے لیے ان کو بڑی بڑی رقوم کی پیشکش کیں مگر نامراد ہی رہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شاہد احمد کہتے ہیں کہ:

"اور جب اپنا پہلا ناول " یاسمین" لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مُزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا ناول "خوابِ ہستی" اسے بھی بغیر کچھ لیے دیے چھپوا دیا۔ ایک پبلشر صاحب لاہور سے دلی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائیں گے۔۔۔ میں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے ۔بولے "آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دیں گے دس ہزار دیں گے مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں اسے چھوڑ کر آپ کے لیے ناول لکھوں پانچ دس ہزار کی بات سن کر پبلشر صاحب کی سیٹی گم ہو گئی اور دو چار منٹ میں پہلو بدل رخصت چاہی۔"(۶۵)

شاہد احمد نے مرزا محمد سعید کی کتاب مذہب اور باطنیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے مکمل ہونے کے بعد ان کے دوست پروفیسر تاجورؔ نجیب آبادی ان سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا محمد سعید کی اس کتاب کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے شاید احمد کہتے ہیں کہ "مرزا صاحب کا یہی صرف ایک علمی کارنامہ ہے مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو کتابیں چھانٹی جائیں تو ان میں "مذہب اور باطنیت "کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔"(۶۶)

شاہد احمد دہلوی نے مرزا محمد سعید کی شخصیت کے بیان میں پطرس کے ادبی حلقے کا تذکرہ بھی کیا

ہے۔ جس میں مشہور ادیب اور شعراء شامل تھے۔ مرزا سعید اس ادبی حلقے کا حصہ تو تھے لیکن بحث مباحثہ ان کو بالکل پسند نہ تھا۔ ایک دفعہ مرزا صاحب اس حلقہ میں رومی اور یونانی تہذیب پر گفتگو تو ان کے علم و فن وسعت سب پر آشکار ہوئی۔ مرزا صاحب کو مطالعے کا بہت شغف تھا ۔ شاہد احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"مرزا صاحب گھنٹوں مطالعہ کرتے تھے ۔ان کے کتب خانے میں ہر علم کی کتاب موجود تھی۔ ملازمت درس و تدریس ہی کی تھی اس لیے نئی سے نئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے۔ کہ اگر میں اتنا مطالعہ نہ کروں تو انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں ؟پنشن لینے کے بعد بھی ان کا واحد مشغلہ مطالعہ کتب ہی رہا۔ ان کا یہ شغل اب تک جاری تھا۔ پنشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔"(۶۷)

استاد بندو خان کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے موسیقی کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کیا ہے شاید احمد دہلوی کو خود بھی علمِ موسیقی سے لگاؤ تھا۔ شاہد احمد دہلوی استاد ممّن خان "شمسِ" موسیقی کی تعریف یوں کی کہ:

"استاد کے والد علی جان خان سارنگی بجاتے تھے اور دلّی کے خاصے مشہور سارنگی نواز وں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جس استاد نے اس خاندان کا نام روشن کیا وہ ممّن خان تھے۔ یہ اپنی بے مثل سارنگی نوازی اور علمی معلومات کی وجہ سے شمسِ موسیقی کہلائے ۔"(۶۸)

ممّن خان کو علمی موسیقی کی بدولت شہرت ملی تو انکی سارنگی کشمیر سے میسور اور بڑودے سے نیپال تک بجی۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا کہ استاد ممّن خان بُڑھاپے میں بھی موسیقی کا درس دیتے تھے۔ انہوں نے بے شمار شاگرد چھوڑے۔ خاکہ نگار کہتے ہیں کہ:

"ہندوستان اور پاکستان میں ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں، مگر انہوں نے اپنی علم و فن کی دو عظیم یادگاریں بھی چھوڑیں ۔ایک ان کے خلفِ اکبر استاد چاند خان اور دوسرے ان کے بھانجے اور خویش استاد بندو خان چاند خان نے گانے میں کمال حاصل کیا اور استاد بندو خان نے سارنگی بجانے میں۔"(۶۹)

علی جان خان نے اپنے صاحبزادے بندو خان کے متعلق بتایا کہ وہ خود اپنی بیٹے کو موسیقی کی تعلیم نہیں دے سکا اور ان کو ممّن خان کا شاگرد کرا دیا۔ بندو خان نے شمسِ موسیقی کے فیض سے آفتاب بنے اور

استاد کے نام کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ خود اتنا نام کمایا کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ شاہد احمد استاد بندو کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

" استاد بندو خان فرماتے تھے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا سلسلہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گھر کے سارے مرد گاتے بجاتے ہیں۔ ایک اس کونے میں گا رہا ہے، ایک اس کونے میں سارنگی لیے بیٹھا ہے۔ نئی سے نئی تان بن کر آ رہی ہیں ۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ یہی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ یہ سب آوازیں بچے کے کان میں پڑتی رہتی ہے اور موسیقی کا شعور بڑھتا رہتا ہے۔"(۷۰)

استاد بندو خان اپنے استاد ممّن خان کی نصیحت کا تذکرہ کیا۔ کہ استاد نے کہا کہ علم جہاں سے بھی ملے لے لینا اس ضمن میں بندو خان کن کن لوگوں کے در پر علم کی پیاس بجھانے گیا ملاحظہ کیجئے:

"بندو خان نے بھاٹوں اور بھنگی چماروں تک سے چیزیں سیکھیں۔ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ہر قسم کی موسیقی ان کے پاس آ گئی۔ سچی لگن اور کھوجنے ان کے لیے موسیقی کے سم سم کے دروازے کھول دیے۔ ُدھرپد سے لے کر چوپائیوں اور دوہوں تک ان کے پاس ہر قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ اسی زمانے میں انہیں پتہ چلا کہ دلّی دروازے کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ کی ایک ٹوٹی ہوئی کوٹھری میں ایک درویش رہتے ہیں۔ ان کے پاس علم بہت دولت ہے۔ نام احمد شاہ ہے۔ اپنے استاد سے ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ بڑی گنی کسبی آدمی ہیں۔ مگر قلب الٹ گیا ہے، دنیا کو تج دیا ہے اور ان پر جذب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اگر ان کچھ حاصل کر سکو تو ضرور کرو۔ خان صاحب نے ان کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ ہاتھ پاؤں سے خدمت بھی، کوئی توجہ نہ ہوئی۔ مگر یہ بھی دُھن کے پکے تھے برابر جاتے رہے۔ ان کی دیلیز کی مٹی لے ڈالی۔ جب بہت عرصہ ہو گیا تو پتھر میں جونک لگی بولے۔ "تو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟ انہوں نے دل کی بات کہی۔ کہنے لگے۔ میں نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے، مگر دنیا مجھے نہیں چھوڑتی اس سے ہمارے کام میں فرق آتا ہے، مگر تو مستحق معلوم ہوتا ہے، ہم تجھے کچھ دیں گے صبح چار بجے آ جایا کر۔"(۷۱)

بندو خان کو علم موسیقی سے محبت تھی ۔ بندو خان نے سارنگی میں دوسرے سازوں کا باج

ڈھالا۔ ایک کر کے سب کو سارنگی میں ڈھال دیا. شاہد احمد نے بندو خان کے علم موسیقی کو نت نئے رنگ دینے اور نئے اصولوں کی تقسیم کی بابت لکھتے ہیں کہ:

> "خان صاحب نے بین، رباب، دلربا، ستار سب کا باج سارنگی میں منتقل کر لیا۔ یہ ان کا ایک ایسا زبردست کارنامہ تھا جس نے سارنگی کو "سورنگی" بنا دیا صدیوں سارنگی سے صرف گھسّے سے بجتی چلی آرہی تھی۔ بندو خان نے اس میں انگلیوں اور گز کی ضرب سے بجانے کے اصول داخل کیے۔ سارنگی بجانے والے بائیں ہاتھ کے ناخن تار کے پہلو سے ملا کر کھسکاتے ہیں اور اس سے سروں کا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ بندو خان نے اس پرانے اصول کی پابندی بھی کی اور ستار، دلربا، بین اور رباب کی طرح تار پر انگلیاں چلانے کا نیا اصول بھی وضع کیا۔"(۷۲)

بندو خان نے اپنے علم و فضل کی بدولت سارنگی کی ساخت پر مختلف تجربات کیے۔ اور مختلف قد و قامت کی سارنگیاں بنائیں۔ لیکن ان کا اصل جوہر بانس کی چھوٹی سارنگی پر ہی کھلتا تھا۔ چھوٹی سارنگی کے بارے میں بیان ہے کہ: "استاد نے اپنے بجانے کے لئے ایک چھوٹی سی سارنگی بانس کی بنالی تھی۔ باج کا تار ردوے کے بدلے فولاد کا ڈالا تھا۔ اس سے اس کی آواز میں بڑی چمک آگئی تھی۔ سنگت بھی اسی سارنگی سے کرتے تھے۔"(۷۳)

شاہد احمد دہلوی کا استاد بندو خان پر لکھا ہوا خاکہ ان کی علم موسیقی سے محبت اور سمجھ بوجھ کا غماز ہے۔ اس خاکے میں شاید احمد نے استاد بندو خان کے فن اور علم کی تعریف کی اور ساتھ ہی اپنی علمی اور ادبی فکر کو بھی قارئین کی نذر کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے "گنجینہ گوہر" میں لکھے گئے خاکوں میں جن شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی علم و ادب سے وابستگی اور علم و ادب کے لیے خدمات کے واقعات کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ شاہد احمد نے مختلف ادبی محافل کا ذکر کیا ہے۔ علم و ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی نشاندہی کی ہے۔ اخبارات رسائل اور کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب کچھ شاہد احمد دہلوی کی علمی و ادبی فکر کی عکاسی کرتا ہے۔

مذہبی فکر

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں مذہب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مذہب اور معاشرہ لازم و ملزوم ہے۔ اسی طرح ادیب اور شعرا اپنی تحریروں میں مذہب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی مکمل تصویر کو اُبھارنے کے لیے خاکہ نگاری میں سیاست و سماج، علم و ادب کے واقعات کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی شامل کیا

جاتا ہے۔ شخصیت کے بیان میں اگر مذہب کو شامل نہ کیا جائے تو شخصیت کی پوری تصویر سامنے نہیں آئے گی۔اس طرح کا خاکہ فنی اعتبار سے بھی ناقص ہو گا۔ خاکہ نگار نے جن لوگوں کی خاکہ نگاری کی ہے۔ان سے خاکہ نگار کے قریبی تعلقات تھے۔ شاہد احمد بیان کردہ شخصیات کے مذہبی خیالات و نظریات کو خوب جانتے تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جو مذہبی واقعات شاہد احمد دہلوی نے اپنی خاکہ نگاری میں شامل کیے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ یہاں ہم شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری میں ان کی مذہبی فکر کا جائزہ لیں گے۔

شاہد احمد نے مولوی نذیر احمد دہلوی کے خاکہ میں مولویوں کے سرسید سے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ مولوی سرسید کو نیچری خیال کرتے تھے۔ اور لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کی مُرقع نگاری کرتے ہوئے شاہد احمد نے اس واقعہ یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

> " ایک دفعہ سرسید احمد خان کالج کے لیے چندہ جمع کرنے لاہور گئے۔ ان کے سب رفیق ہم رکاب تھے۔ سید صاحب کو توقع تھی کہ زندہ دلانِ پنجاب سے بہت روپیہ ملے گا۔ سو دوست -سو دشمن۔ سید صاحب کے مخالفین میں مولویوں کی ایک بااثر جماعت کی تھی جس نے سید صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کو "نیچری" موسوم کر کے خوب مخالفانہ پروپیگنڈا کیا تھا۔۔ نماز جمعہ کے بعد جب سید صاحب کھڑے ہوئے تو سارے نمازی انہیں نیچری اور کافر کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ صرف مٹھی بھر آدمی بیٹھے رہ گئے۔ "(۷۴)

اسی خاکہ میں آگے چل کر شاہد احمد دہلوی نے مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کو عربی میں غیر معمولی استعداد حاصل تھی۔ لوگوں کا بھرپور اصرار تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کریں مگر وہ پس وپیش سے کام لیتے رہے۔ آخر کار مولویوں اور عالموں کے مشورے سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ شاہد احمد دہلوی نے مولوی نذیر احمد کی غیر معمولی احتیاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا ایک ایک لفظ پر ردوقدح ہوئی اور بالآخر ایک رائے ہو کر ترجمہ لکھ لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک نابینا سید عالم کو پڑھ کر سنایا گیا اور ایک اور عالم کو نظر ثانی کے لیے باہر بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح ہوئی اور پروف دیکھے گئے تب بھی ان میں ترمیم کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا پورا اطمینان نہیں ہو گیا اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال

لگ گئے مگر ترجمہ بھی ایسا شُستہ رُفتہ اور بامحاورہ ہوا کہ اب پچھلے پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع نہیں ہو سکا۔"(۷۵)

خواجہ حسن نظامی کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ آپ کے مُریدین کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ آپ کی دعوت و تبلیغ کی بدولت بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان میں نچلی ذات کے ہندوؤں سے لے کر مہاراجے تک شامل تھے۔ اس ضمن میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"معاملاتِ روحانی میں اتنی ترقی کی کہ تین لاکھ مریدوں کا مُرشدِ کامل بنا۔ مبلغِ اسلام بنا اچھوتوں سے لے کر راجہ مہاراجاؤں تک کو حلقہ بگوشانِ اسلام میں لا شامل کیا۔"(۷۶)

شاہد احمد دہلوی نے خواجہ حسن نظامی کو ایک مشہور و معروف مذہبی پیشوا بنا کر پیش کیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ خواجہ صاحب کو ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے لوگوں میں بھی قدر و منزلت حاصل تھی۔ شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

" روایت عام کے مطابق خواجہ صاحب کے تین لاکھ مُرید تھے۔ ہندو اور عیسائی بھی ان کے مُرید تھے۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مُرید تھی فرماتے تھے کہ برنارڈ شاہ بھی میرا مُرید ہے اور پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہشتم) نے بھی میرے مُریدوں میں شامل ہونے کے لئے مجھے چٹھی لکھی ہے۔"(۷۷)

بشیر الدین احمد دہلوی کے خاکے میں بھی شاہد احمد نے ان کو مذہب سے محبت کرنے والی شخصیت قرار دیا۔ بشیر الدین احمد صوم و صلوۃ کے پابند تھے۔ شاہد احمد نے بشیر الدین احمد کے رمضان شریف کے معمولات کو خاص طور پر بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابّا بڑے مذہبی خیال کے آدمی بھی تھے۔ ان کی ابتدائی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ بڑی خوبصورت پھریری ڈاڑھی تھی ابّا کی، مگر دو انگشتے سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ اتنی ہی داڑھی دادا ابّا کی بھی تھی۔ مگر چھدری ابّا کا خط بھرواں تھا۔ نماز پابندی وقت کے ساتھ پنج وقتہ پڑھتے تھے۔ رمضان شریف میں ترابیاں (تراویح) بھی پڑھنے جاتے تھے۔ قرآن شریف روانی اور خوش الحانی سے پڑھتے اور ماہ صیام میں ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتے۔ ہم سب کو بھی نماز روزے کی تاکید تھی۔ سحری اور افطار میں سب شریک

ہوتے ۔ محلے کی مسجد میں افطاری ضرور بھجوائی جاتی ۔میلاد اوروعظ بھی ہوتا تھا۔"(۷۸)

بشیر الدین احمد چونکہ شاہد احمد دہلوی کے والد ہیں۔ تو اس قربت کی وجہ سے بشیر الدین احمد وہ شخصیت ہے جن کو شاہد احمد دہلوی نے بہت قریب سے دیکھا۔ شاہد احمد دہلوی بشیر الدین احمد کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ کہ وہ صرف عبادات کے قائل نہیں تھے بلکہ دوسرے معاملات میں بھی مذہبی تھے معاشرے کے نادار طبقوں کا خیال بھی کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"زکوۃ بھی ابّا بڑی پابندی سے نکالتے تھے۔ غریب اور مسکین رشتہ داروں اور کنبہ داروں کے ماہانے مقرر تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کا حق ان کے بعد آتا تھا۔ ان کے بعد کار خیر کا نمبر تھا۔ جاڑوں میں لحاف بنوا کر تقسیم کرتے اور گرمیوں میں لٹھے ململ کے جوڑے۔ حج کو جانے کا ارادہ ہی کرتے رہے۔ ہم سب کی شادیاں کر چکے تھے، صرف میری سب سے چھوٹی بہن رہ گئی تھی اس کی شادی کے بعد جاتے مگر اس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔"(۷۹)

بشیر الدین احمد دہلوی کے خاکے میں بھی شرر کے ایک ناول "بدرالنسا" کی مصیبت کا تذکرہ بھی ہے۔ شرر صاحب نے پردے کے بارے میں اپنے جدید خیالات کی ترجمانی ہے۔ شرر صاحب نے اس کی ایک کاپی والد صاحب کو بھیجی اور ساتھ یہ درخواست کی کہ وہ بھی پردے کے معاملے پر لکھیں اور میری تائید کریں۔ والد صاحب قدرے آزاد خیال ضرور تھے مگر مذہبی اوامر و نواہی پر سختی سے کاربند تھے شاہد احمد نے پردے کے معاملے پر اپنے گھر کا احوال بیان کرتے ہوئے اس جواب کا بھی ذکر کیا ہے جو والد صاحب نے شرر صاحب کو لکھا۔ لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے گھر میں سختی سے پردہ کیا جاتا تھا۔ گھر کی عورتیں کہیں ملنے ملانے یا شادی غمی میں جاتی تو گھر کی بند بگھّی میں یا ڈولی میں۔ اور ڈولی کے پردے پر بھی ایک چادر ڈال دی جاتی۔ بارہ برس سے زیادہ عمر کا لڑکا زنانہ گھر میں ملازم نہیں رکھا جاتا تھا۔ شرر کا خط جب آیا تو ابّا خوش مذاقی کے موڈ میں تھے جواب میں لکھا کہ "ایسا کیجیئے کہ پہلے آپ اپنی بیوی اور بچیوں کو لا کر میرے سامنے کیجئے پھر میں آپ کی تائید کروں گا ۔کارِ خیر گھر سے شروع ہونا چاہیئے ۔"خبر نہیں اس کے بعد کیا گزری۔ شرر تو نہیں آئے۔"(۸۰)

میر آجی کی مرقع نگاری میں شاہد احمد دہلوی نے میر آجی کی مذہب سے دوری کو بیان کیا ہے۔ میر آجی کو مذہب سے بالکل لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اخلاقی ضابطوں سے بھی ذہنی طور پر آزاد تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے میر آجی کو دل و دماغ کا کافر کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"مذہب سے میر آجی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہندو صنمیات سے انہیں شغف تھا۔ اسی کا رچا پچا تصور ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ بس مسلمان اس لیے تھے کہ ایک مسلمان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا ہوں وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا؟ میر آجی کے تو دل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے۔"(۸۱)

میاں اسلم کی خاکہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی نے انکی اسلامی جذبات کا ذکر کیا ہے اور انہیں اسلام کا سچا ہمدرد بتایا ہے۔ اس ضمن میں دلیل کے طور پر ان کے ناولوں کا حوالہ دیا ہے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"اسلم صاحب عوامی ادیب ہی نہیں وہ مسلمان بھی ہیں وہ اپنے دل میں اسلامی جذبات اور اسلام کا صحیح درد بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کے ناولوں میں پاکستانی ادب کے اساسی تصورات بھی رواں دواں نظر آتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ناول پاکستانی ادب کے ذیل میں بھی آسکتے ہیں اس وقت اردو میں کوئی ایسا عوامی ناول نگار نہیں جو ایم اسلم کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکے ایم اسلم اردو کے عوامی ادب کے سب سے بڑے علمبردار ہے۔"(۸۲)

جوش ملیح آبادی کا تعلق کانگریس سے تھا۔ شاہد احمد نے جوشؔ کے خیالات کو گستاخانہ اور ملحدانہ کو بیان کہا ہے۔ شاہد احمد نے انہیں رکابیہ مذہب کا حامل کہا ہے۔ جوش ملیح آبادی ضدّی طبیعت کے مالک تھے۔ شاہد احمد جوشؔ ملیح آبادی کے لکھتے ہیں کہ:

"جوشؔ نے ہمیشہ اپنے ترنوالے کی خیر منائی۔ جو شخص خدا کا مذاق اڑا سکتا ہے ابلیس اور ابو جہل کی عظمت کی قسم کھا سکتا ہے۔ اس کے لیے پاکستان اور قائد اعظم کو برا بھلا کہنا کیا مشکل ہے۔ جو شخص ازراہِ تمسخر نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی سے ایسی باتیں کرتا ہو تو اس کے لیے مسلمان کیا اور پاکستان کیا؟ ڈٹ کر پاکستان کی مخالفت کی اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ ہندو پرستی کا یہ عالم رہا کہ گاندھی جی کے ہلاک ہونے پر جوشؔ صاحب نے اپنی نظم "شہید اعظم" لکھی۔"(۸۳)

شاہد احمد دہلوی نے اپنی خاک نگاری میں جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان کی مذہبی خدمات، رجحان، عبادات اور معاملات کو مختصراً بیان کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے غیر جانبدار رہتے ہوئے مذہبی عنصر کو بیان کیا۔ اور کسی بھی جگہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاہد احمد دہلوی کا مسلک کیا ہے۔ اور کیا وہ کسی خاص مسلک یا فرقہ کی جانب جھکاؤ تو نہیں رکھتے۔ میر آجی کی خاکہ نگاری شاہد احمد دہلوی نے میر اجی کو دل و دماغ کا کافر کہا ہے ۔ لیکن اگلے ہی پیراگراف میں شاہد احمد نے میر اجی کو ایک شریف انسان بتایا ہے اور قاری کے دل میں میر اجی کے لئے ہمدردانہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنی خاک نگاری میں مذہب کو یوں بیان کیا کہ قاری شخصیات کے مذہبی نقطہ نظر کو جان سکے۔ آپ نے واقعات کے چُناؤ میں حد درجہ احتیاط برتی ہے اور اپنی مذہبی فکر اپنی خاکہ نگاری میں نہایت عُمدگی سے سمو دیا ہے۔

ج۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فکری تقابل:

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی خاکہ نگاری کے میدان میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ دونوں خاکہ نگاروں نے سماج کی مختلف شخصیات کی خاکہ نگاری اپنے اپنے مخصوص انداز میں کی ہے۔ وہ ان شخصیات کا سماجی، فکری، مذہبی اور علمی وادبی لحاظ سے باریک بینی سے مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں خاکہ نگاروں نے نے جو مختلف ادیبوں اور شاعروں کے خاکے پیش کیے ہیں۔ ان میں بہت سے پہلو مشترک ہیں تاہم کہیں کہیں افتراقات بھی موجود ہیں۔

اشتراکات:

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے تحریک علی گڑھ سے وابستہ کچھ شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کے بقول اس تحریک ان کے سوچنے کا انداز تبدیل کر دیا ہے۔ اس تحریک نے ادب برائے ادب کے دائرے سے نکل کر سیاسی اور سماجی افکار کو جگہ دی۔ پھر انقلاب روس کا بھی اثر ہوا۔ جس کی وجہ سے سماجی اور سیاسی مسائل کو ادب میں اہمیت دی جانے لگی۔ دونوں خاکہ نگاروں کی خاکہ نگاری میں ایک اور اہم مشترک پہلو یہ ہے کہ انسان کی کامیابی کا راز محنت میں پوشیدہ ہے۔ محنت اور قابلیت کے بغیر کامیابی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔

دونوں مصنفین نے خاکے لکھتے ہوئے شخصیات کے مثبت پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سامنے لانے کو

کوشش کرتے ہیں۔ جس کا ایک مقصد معاشرے کے اندر اعلیٰ اخلاق کو فروغ دینا بھی ہے۔ وہ خاکہ نگاری کرتے ہوئے ان شخصیات کی سخاوت، خوش خلقی، فرض شناسی، ایمانتداری، دیانتداری، وسعت قلبی اور صداقت جیسے اعلیٰ اوصاف کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

دونوں مصنفین نے شخصیات نگاری کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ان کی ذات میں موجود منفی عناصر کو بھی سامنے لایا ہے۔ وہ کئی شخصیات کی رشوت، اقرباء پروری اور دوسری سماجی برائیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ دونوں خاکہ نگاروں نے اپنے اپنے خاکوں میں ہندوؤں، سکھوں، انگریزوں اور مسلمانوں کے سیاسی افکار کا جائزہ لیا ہے۔

دونوں خاکہ نگاروں نے مختلف شخصیات کا باریک بینی سے جائزہ سے لیا ہے۔ وہ جہاں ان کی شخصیات کی اعلیٰ اقدار کو بیان کرتے ہیں۔ وہیں ان شخصیات کی زندگیوں کے تاریک پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً مختلف شخصیات کی شراب نوشی کی عادت کو دونوں ادیبوں نے بیان کیا ہے۔

شخصیات نگاری کرتے ہوئے دونوں خاکہ نگار متعلقہ شخصیات کے عظیم کارناموں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے ان کے مالی اور قلمی کاموں کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ "گنجینہ گوہر" اور "چند ہم عصر" میں خاکہ نگاری کے منظم اصولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

خاکہ نگاری کرتے ہوئے دونوں خاکہ نگار شخصیات رہن سہن، طور اطوار اور سماجی آداب کا بڑی عمدگی سے تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ وہ باطنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے ظاہری خصوصیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ خاکہ نگاروں نے شخصیات کی سیاسی زندگی اور کارناموں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے عُزیز مرزا کی سیاسی خدمات خصوصاً مسلم لیگ کو فعال اور زندہ رکھنے کے کردار کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

دونوں خاکہ نگاروں کے خاکوں کے مطالعے سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ قوم کی پہچان ثقافت اور فکر سے وابستہ ہے۔ جو قومیں دوسری قوموں کی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیتی ہیں۔ وہ اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہیں۔

"گنجینہ گوہر" اور "چند ہم عصر" میں خاکہ نگاروں نے انگریزوں کے برصغیر کے لوگوں کے ساتھ طرز عمل کی بھی عکاسی کی ہے کہ انگریز کس طرح مقامی لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انگریز حسب و نسب کو زیادہ اہمیت دیتے اور اپنے وفاداروں کو خوب نوازتے تھے۔ طوائف الملوکی اور انتشار کی سیاست کا بیان دونوں مصنفین کے ہاں ملتا ہے۔

مہمان نوازی جو کہ مسلم تہذیب کا خاصا ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں کے خاکوں سے اس بات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ مختلف شخصیات حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ دونوں شخصیات نگاروں کے خاکوں کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں خاکہ نگار علم دوست ہیں۔ ان کی خاکہ نگاری میں ادبی تنقید عناصر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ علم اور کتاب دوستی کے عناصر کا بہت زیادہ بیان ان کی علم دوستی کی واضح دلیل ہے۔

دونوں خاکہ نگار علمی و ادبی شخصیات کی عکاسی کرتے ہوئے اُن کے ادبی کارناموں کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف و تالیف کی نمایاں سرگرمیوں کو خاص طور پر بیان کرتے ہیں۔ جیسے مولوی عبدالحق حیرت مرزا کے حافظے کو خراج تحسین پیش کرتے اور ان کے ادبی کام کو سراہتے ہیں۔ شخصیات نگاری کرتے ہوئے خاکہ نگار متعلقہ شخصیات کے ہم عصر ادیبوں اور ان کے ساتھیوں کی مصروفیات اور ان کی نمایاں خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔

دونوں خاکہ نگاروں کی خوبی ہے کہ وہ یہاں شخصیات کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں ان کے اعلیٰ ادبی کارناموں پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

دونوں خاکہ نگار بین اللسانی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں وہ اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کی اہمیت و افادیت کے قائل ہیں۔ دونوں خاکہ نگاروں کے خاکوں میں مختلف لغات، شعراء، اردو اور فارسی کے مختلف تصانیف کا بیان بھی ہے۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے شخصیات نگاری کرتے ہوئے ان شخصیات کے مختلف دلچسپیوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ کن کن شخصیات کو فلسفہ، منطق، علم نجوم اور علم طب کو شوق تھا۔

خاکہ نگاری میں مذہبی رجحانات کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ دونوں خاکہ نگار مذہبی تعصب سے اجتناب کرتے اور مذہبی رواداری کو فروغ دیتے ہیں۔ اسلامی اخوت کا پرچار کرتے اور مذہب و ملت سے محبت کرتے ہیں۔ دونوں خاکہ نگاروں نے مختلف شخصیات کی مذہبی خدمات کو سامنے لایا ہے۔ وہ کس طرح قرآن و حدیث سے رہنمائی لیتے اور شریعت پر عمل کرتے ہیں۔ ان کو مذہبی کتب سے کس قدر عشق ہے۔ وہ مذہبی افکار اور نظریات کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔ ان تمام جزئیات کی تصویر کشی دونوں خاکہ نگاروں نے خوب کی ہے۔

افتراقات:

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کی خاکہ نگاری میں یہاں بہت سے مشترک پہلو ہیں تاہم کہیں کہیں کچھ افتراقات بھی ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں۔

"گنجینہ گوہر" میں عام طور پر شخصیات اور سماج کی مثبت تصویر کشی کی گئی ہے۔ جبکہ "چند ہم عصر" میں خاکہ نگار نے شخصیت کے ساتھ اس وقت کے حکمرانوں پر تنقید بھی کی ہے۔ ان کے خاکوں میں حکومتی لوٹ کھسوٹ کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ رئیسوں سے نذرانے وصول کرنے کے ساتھ عام عوام پر ظلم و ستم بھی ڈھایا ہے۔ اس ظلم و ستم سے تاجر برادری کا حکومت پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ شاہد احمد نے مولوی عنایت اللہ کے خاکے میں حکمرانوں کے جبر اور رعایا کی بے بسی کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

مولوی عبدالحق عام طور ظاہری شخصیت کی عکاسی محدود کرتے ہیں۔ لیکن شاہد احمد دہلوی متعلقہ شخصیت کے لباس، طرز رہائش اور ان کے خصوصی پکوانوں تک ذکر کر جاتے ہیں۔ بشیر الدین کے خاکے میں اس کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی شخصیت کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے بعض اوقات سخت الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً میر ناصر علی کے خاکے میں یہاں وہ انگریزوں سے مراعات کے حصول کے لیے وفاداریاں نبھانے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں وہ میر ناصر کو خوشامدی تک کہہ دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں واعظ و نصیحت شاہد دہلوی کے خاکوں کی نسبت زیادہ ہے۔ شاہد احمد کے خاکوں میں بعض اوقات شعراء اور ادیبوں کی رقابت کے بھی تذکرے ملتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کے ہاں مذہبی عکاسی مولوی عبدالحق سے قدرے مختلف ہے۔ شاہد احمد دہلوی مدرسہ اور مساجد میں علماء کے کردار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے جاپان کے سیاسی اور معاشی عدم استحکام کا راز بتایا ہے کہ کس طرح اس قوم نے تباہ حالی کے بعد ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ مولوی چراغ حسن کے خاکے میں اس کی ترجمانی ملتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں مولوی عبدالحق کی نسبت مختلف شخصیات کی کسمپرسی اور ان کی معاشی تنگدستی کا بھی تذکرہ زیادہ ملتا ہے۔ خصوصاً منٹو کے خاکے میں اس کا نمایاں بیان ملتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی دلی میں نفاست کی عدم دستیابی پر شدید برہم ہوتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں متعلقہ خطے کی ثقافتی سرگرمیوں کی نمایاں عکاسی ہوتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی میراجی کے خاکے میں ان کے مذہب سے عدم لگاؤ پر ان کے آڑے ہاتھوں لیتے

ہوئے اس کو دل و دماغ کا کافر بھی قرار دے دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ جوشؔ کے گستاخانہ اور ملحدانہ خیالات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ شاہد احمد، مولوی عبدالحق کی نسبت زیادہ غیر جانبداری سے شخصیت نگاری کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں مختلف شخصیات کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا بھی بیان ملتا ہے۔

مجموعی طور پر دونوں خاکہ نگاروں نے اپنے اپنے طور پر عمدہ شخصیات نگاری کی ہے۔ وہ شخصیات کا ظاہری اور باطنی جائزہ باریک بینی سے لیتے ہیں۔ انہوں نے شخصیات کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے ان کے سیاسی و سماجی حالات کے تذکرے کے ساتھ ان کی مذہبی فکر کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان خاکوں کی مدد سے اس دور کی سیاست کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا اور ساتھ میں اس دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ الغرض ان دونوں خاکہ نگاروں کے خاکے اپنے عہد کی ترجمانی بھرپور طریقے سے کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔احتشام حسین، سیّد، پروفیسر، عکس اور آئینے، سرفراز پریس لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۲ء ص۱۰۹

۲۔عبدالحق، مولوی، چند ہم عصر، علم و عرفان پبلشرز، لاہور ۲۰۱۱ء ص۱۱

۳۔ایضاً، ص۱۶

۴۔ایضاً، ص۲۶

۵۔ ایضاً، ص۲۷۔۲۸

۶۔ ایضاً، ص۳۲۔۳۳

۷۔ ایضاً، ص۳۷

۸۔ ایضاً، ص۵۲

۹۔ ایضاً، ص۶۲

۱۰۔ ایضاً، ص۶۳

۱۱۔ ایضاً، ص۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص۶۷

۱۳۔ ایضاً، ص۷۸

۱۴۔ ایضاً، ص۹۲۔۹۳

۱۵۔ایضاً، ص۱۰۲

۱۶۔ایضاً، ص۱۰۳

۱۷۔ایضاً، ص۱۰۸

۱۸۔ایضاً، ص۱۰۵

۱۹۔ایضاً ص۷

۲۰۔ایضاً، ص۹

۲۱۔ایضاً، ص۱۸

۲۲۔ایضاً، ص۴۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۴۔۴۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۱۔۴۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۹۔۷۰

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۸۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۵

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۴۳۔۴۴

۳۸۔ شاہد احمد، گنجینہ گوہر، مکتبہ نیا دور، کراچی، ۱۹۶۲، ص ۱۹

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۳۔۳۴

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۳

۴۶۔ایضاً،ص۸۹۔۹۰

۴۷۔ایضاً،ص۔۹۲

۴۸۔ایضاً،ص۹۲

۴۹۔ایضاً،ص۱۰۳

۵۰۔ایضاً،ص۱۰۴۔۰۵

۵۱۔ایضاً،ص۱۵۲

۵۲۔ایضاً،ص۲۱۵۔۱۶

۵۳۔ایضاً،ص۲۲۲۔۲۳

۵۴۔ایضاً،ص۲۳۰۔۳۱

۵۵۔ایضاً،ص۵۰

۵۶۔ایضاً،ص۵۱

۵۷۔ایضاً،ص۶۴

۵۸۔ایضاً،ص۶۶

۵۹۔ایضاً،ص۶۷

۶۰۔ایضاً،ص۱۳۲

۶۱۔ایضاً،ص۱۳۴

۶۲۔ایضاً،ص۔۱۴۵۔۴۶

۶۳۔ایضاً،ص۱۴۶

۶۴۔ایضاً،ص۱۴۶

۶۵۔ایضاً،ص۱۷۲

۶۶۔ایضاً،ص۱۷۳

۶۷۔ایضاً،ص۱۷۵۔۷۶

۶۸۔ایضاً،ص۱۷۸

۶۹۔ایضاً،ص۱۷۹

۷۰۔ ایضاً، ص۱۷۹

۷۱۔ ایضاً، ص۱۸۰۔۸۱

۷۲۔ ایضاً، ص۱۸۱۔۸۲

۷۳۔ ایضاً، ص۱۸۴

۷۴۔ ایضاً، ص۲۰

۷۵۔ ایضاً، ص۲۵

۷۶۔ ایضاً، ص۶۴

۷۷۔ ایضاً، ص۶۸

۷۸۔ ایضاً، ص۹۱

۷۹۔ ایضاً، ص۹۲

۸۰۔ ایضاً، ص۹۶

۸۱۔ ایضاً، ص۱۴۱

۸۲۔ ایضاً، ص۲۰۳

۸۳۔ ایضاً، ص۲۲۵

باب سوم:

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری: فنی تقابل

الف۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا فنی جائزہ

مولوی عبدالحق مشہور و معروف ادیب و تنقید نگار تھے۔ آپ بلند پایہ کے ترجمہ نگار و تاریخ داں بھی تھے۔ خاکہ نگاری کے فن کو بھی آپ نے آگے بڑھایا "چند ہم عصر" اس کی زندہ مثال ہے۔ آپ کی یہ تخلیق اردو خاکہ نگاری کی روایت میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے خاکوں میں انھی شخصیات کو شامل کیا جو قابلِ تعریف تھیں اور جن سے ہمیں سبق مل سکے۔ آپ نے ایسی شخصیات کا انتخاب کر کے اپنے خاکوں کو اور بھی اہمیت بخشی ہے۔

"چند ہم عصر" میں مولوی عبدالحق نے اپنے ہم عصروں کی سیرت کو اُجاگر کیا ہے۔ "چند ہم عصر" کی ادبی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کی بدولت جہاں قاری مختلف شخصیتوں سے واقف ہوتا ہے وہیں مولوی عبدالحق کی شخصیت کو جاننے میں بھی مدد حاصل ہوتی ہے۔ خاکے کے جدید فن میں مولوی عبدالحق غیر معمولی حیثیت کے مالک ہیں۔ "چند ہم عصر" کے خاکوں کو پڑھنے سے یہ حقیقت قاری پر آشکار ہوتی ہے کہ سرسید کے عہد سے لیکر مولوی عبدالحق کے عہد تک مسلمانوں نے علم و فضل اور شعر وادب کے میدان میں کون کون سے کارنامے انجام دیئے۔ ان خاکوں میں ہلکی پھلکی طنز و مزاح بھی ملتی ہے۔ بحیثیت خاکہ نگار مولوی عبدالحق اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی اردو سے محبت کی ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ "چند ہم عصر" میں بھی وہ اردو کو تعلیم کا بہترین ذریعہ قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ اردو کی ترقی اور اشاعت مولوی عبدالحق کی زندگی کا مقصد تھا اور اس کی واضح مثال کراچی میں اردو کالج کا قیام ہے۔ مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے ذریعہ سے بھی اردو ادب اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ہم عصر دوستوں اور ادیبوں کو اپنے خاکوں میں پیش کرتے ہوئے ان کی سیرت اور خیالات کو پیش کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں ادیب، شاعر، سیاست داں، مذہب سے وابستہ لوگ، امراء اور غریب سبھی لوگ شامل ہیں یعنی معاشرے کے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں سے انھیں انس و دلچسپی تھی۔

"چند ہم عصر" میں طویل خاکے بھی ملتے ہیں اور مختصر بھی۔ مولوی عبدالحق کا سب سے طویل

خاکہ "مولوی چراغ علی" پر ہے۔ آپ کی خاکہ نگاری کا سب اہم ترین پہلو ان کے ہم عصر رفقاء اور ادباء کی موت ہے۔ مولوی عبدالحق نے جتنے بھی خاکے تحریر کیے ہیں وہ اُن کے دوستوں کی وفات کے بعد کے ہی ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق کی اپنے رفقاء سے عقیدت کا اظہار ہے کہ انھوں نے ان کی وفات کے بعد ان پر قلم اُٹھایا۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں ان کی تحقیقی نظر اور اُسلوب بیان خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ روز مرّہ کے محاورات بھی بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی خاکہ نگاری کے ذریعے شخصیات کے اخلاقی پہلوؤں اور ایثار و قربانی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ مولوی عبدالحق اپنے خاکوں میں خود بہت کم نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور اگر "چند ہم عصر" کو دیکھا جائے تو اس میں کردار نگاری اور واقعات کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور مصنف کی ذاتی واقفیت اور سماج کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مولوی صاحب کی خاکہ نگاری کی اصل خوبی آپ کا اُسلوب بیان ہے۔ مولوی عبدالحق کے اُسلوب بیان کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عبارت آرائی اور محاورے کا بے جا استعمال نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق کا اُسلوب آسان اور واضح ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحریروں میں سادگی اور سلاست ہے۔ مولوی عبدالحق کے اُسلوب کی جانچ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں بول چال کی عام زبان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اختصار بھی مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں کا جزو ہے۔ آپ نے واقعات کو مختصراً بیان کرتے ہوئے شخصیت کی پوری جھلک بھی قاری کو دکھائی۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں جس عنصر کا فقدان نظر آتا ہے وہ سراپا نگاری ہے۔ خاکے کے اس اہم عنصر کو آپ نے اپنی خاکہ نگاری میں بہت کم جگہ دی ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنی خاکہ نگاری میں خاکے کے فنی لوازم کو مدِ نظر رکھا ہے۔ آپ نے اختصار ، سراپا نگاری ، واقعات نگاری اُسلوب اور مواد جیسی فنّی خصوصیات کو خاص اہمیت دی ہے۔ لیکن سراپا نگاری شاید ایک یا دو خاکوں میں ہی نظر آتی ہے۔ یہاں ہم مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے اُن کے فن پر نظر ڈالیں گے۔

اختصار

اختصار خاکہ نگاری کا ایک اہم جزو ہے اور یہی خوبی خاکے کو سوانح سے الگ شناخت مہیا کرتی ہے۔ خاکے کے اختصار یا طوالت کا انحصار دستیاب مواد پر ہوتا ہے۔ خاکہ نگار موضوعِ خاکہ کے جس قدر قریب ہو گا اس کے پاس مواد کی اُسی قدر فروانی ہو گی۔ مواد کی یہی فراوانی ایک خاکہ نگار کو کو مشکل صورتِ حال سے

دوچار کرتی ہے۔ایک ماہر خاکہ نگار اپنے حُسنِ انتخاب سے صرف ایسے واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو شخصیت کی مُرقع نگاری کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔وہ صرف ان واقعات یا تفصیلات کو کو بیان کرتا ہے جس سے شخصیت کے نمایاں پہلو اُجاگر ہو سکیں۔ خاکے میں قارئین کی دل چسپی کی ایک اہم وجہ اس کا اختصار ہی ہے۔اگر خاکہ طویل ہو گا تو ربط قائم نہیں رہے گا اور یوں قاری اس لذت اور چاشنی سے محروم رہے گا جس کا وہ متلاشی تھا۔خاکے میں اختصار کی خوبی کو پرونا ایک مشکل کام ہے۔اگر خاکہ نگار خاکے کو مختصر کرتے ہوئے کچھ اہم واقعات کو شامل نہیں کرتا تو اس سے ممدوح شخصیت کے متاثر ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور قاری شخصیت کے کچھ ایسے اہم پہلوؤں سے صرف اس لیے روشناس نہیں ہو پاتا کہ خاکہ نگار اختصار کے پہلو کو مدّ نظر رکھے ہوئے تھا۔یوں اس کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔اختصار کا مطلب یہ نہیں کہ خاکہ دو سے تین صفحات پر مشتمل ہو،یقیناً یہ ایک پہلو تو ہو سکتا ہے لیکن یہاں جس اختصار کی بات ہو رہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خاکہ نگار موضوعِ خاکہ کے متعلق الفاظ کا چناؤ اور واقعات کا انتخاب کچھ اس طرح کرے کہ بہت ہی کم الفاظ میں شخصیت کی بھرپور تصویر سامنے آ جائے۔اگر مصنف کسی شخص کی صرف سیاسی سرگرمیوں بیان کرے گا تو اس سے نہ صرف خاکہ طوالت اختیار کرے گا بلکہ قاری کے سامنے اس کا ایک ہی پہلو اُجاگر ہو سکے گا۔اس ضمن میں اگر خاکہ نگار صرف موضوعِ خاکہ کی سیاسی فکر کو بیان کر دے اور باقی کا کام قاری پر چھوڑ دے تو اس سے جہاں ایک طرف خاکے میں اختصار کا عنصر نمایاں ہو گا وہاں قاری بھی موضوعِ خاکہ کے بارے میں اپنی کچھ رائے قائم کرنے کے قابل ہو گا۔ڈاکٹر صابرہ سعید "اردو ادب میں خاکہ نگاری" میں اختصار کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> "خاکہ اگر مختصر ہو تو قاری اس کو ایک ہی نشت میں ختم کر سکتا ہے مختصر خاکے میں واقعات اس قدر اختصار کے ساتھ اور شخصیت اس قدر جامع پیش کی جاتی ہے کہ قاری کا ذہن اس کا بھرپور تاثر قبول کرتا ہے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ خاکے میں اختصار پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔اس کے لیے صحیح قوتِ فیصلہ،اہم باتوں کے انتخاب کا سلسلہ اور ترتیب کا سلسلہ درکار ہوتا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحبہ نے بھی خاکے میں اختصار کو ایک مشکل کام سے تعبیر کیا ہے اور اس ضمن میں خاکہ نگار کی درست قوتِ فیصلہ کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔اگر خاکہ نگار نے اہم واقعات کو نظر انداز کرے گا تو شخصیت کے بیان میں جھول ہو گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی خاکہ نگاری کو سیرت نگاری سے الگ کرتے ہوئے اس کو

مختصر افسانے کی طرح ادب کی ایک مقبول صنف قرار دیا ہے۔ خاکہ نگاری میں اگر اختصار نہیں ہو گا تو خاکہ، خاکہ نہیں بلکہ سیرت نگاری بن جائے گا۔ اختصار خاکے کا بنیادی جزو ہے۔ "گنجینہ گوہر کے دیباچے میں "ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "خاکہ نگاری، سیرت نگاری سے بالکل الگ۔۔۔ مختصر افسانے کی طرح ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔"(۲) ڈاکٹر جمیل جالبی نے خاکے کو سیرت سے الگ افسانے کی طرح کی ایک صنف کہا ہے۔ اس صنف کی مقبولیت کا راز اس کا اختصار ہی ہے۔ اختصار کی خوبی ہی قاری کو اپنی جانب مائل کرتی ہے۔ اگر خاکے میں اختصار نہیں ہو گا تو خاکہ، خاکہ کی بجائے سوانح کہلائے گا۔ مولوی عبد الحق نے "چند ہم عصر" کے خاکوں میں اختصار کے پہلو کو مدّ نظر رکھا ہے۔ ایجاز واختصار مولوی صاحب کے خاکوں کا اہم جزو ہے۔ آپ نے کم سے کم الفاظ میں اپنے معاصرین کی جیتی جاگتی تصاویر پیش کی ہیں۔ آپ نے غیر اہم واقعات اور تفاصیل سے ممکن حد تک گریز کیا ہے۔ مولوی عبد الحق "منشی امیر" کے خاکے میں منشی امیر احمد کے حالات اور واقعات کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ منشی امیر احمد کے آباؤ اجداد، تعلیم اور آپ کی علمی ادبی کاوشوں کو مختصر طور پر بیان کر کے ایک جامع تصویر قارئین کے سامنے رکھی گئی ہے ۔مولوی عبد الحق نے منشی امیر احمد کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قادرالکلامی کی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "ان کے بعض اشعار بہت صاف اور عمدہ نکل گئے ہیں۔ منشی صاحب کا اخیر کلام اور بھی زیادہ صاف ہو گیا ہے اور بھونڈے استعارات کے کے لچھے بہت کم نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے چند شعر نقل کرتے مگر چونکہ ان کا کلام بے انتہا مشہور ہو چکا ہے اور ان کے دیوان قریباً ہر شوقین کے پاس موجود ہیں اس لیے ضرورت نہ سمجھی گئی۔ علاوہ اس کے منشی صاحب مرحوم اردو شاعری کی تمام اصناف پر قادر تھے۔ قصائد بلند اور پُر زور ہیں۔ ترجیع بند، واسوخت وغیرہ سب اپنی طرز پر اچھے لکھے ہیں"۔(۳)

مولوی عبد الحق نے منشی صاحب کی قادرالکلامی کے بعد ان کی "امیر اللغات" کا ذکر کرتے ہوئے اس لغت کی اشاعت کے مراحل کو مختصراً بیان کیے ہیں ۔مولوی عبد الحق نے انگریزوں کی علمی خدمات، اردو کی ترقی ہندی بھاشا، عربی اور فارسی کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے۔ مولوی عبد الحق نے منشی امیر احمد کے خاکے میں ان کی علمی ادبی اور مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے انگریزوں اور عمائدین حکومت سے

تعلقات کو بیان کر کے ان کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ مولوی چراغ علی کا خاکہ قدرے طویل ہے۔ خاکے میں چراغ علی کی ابتدائی زندگی کے ایّام کا بیان تو مختصر ہی ہے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی اور مولوی چراغ علی کے مذہبی خیالات و نظریات اور ان کی خدمات کو زیادہ کُھل کر بیان کیا گیا ہے۔ شاید مولوی عبدالحق نے تمام کے تمام واقعات کو ضروری سمجھا ہو گا لیکن اس سے خاکے کے حُسن میں فرق ضرور آیا۔ مولوی عُزیر مرزا مرحوم کی مُرقع نگاری میں ان کی موت کو ابتداء میں بیان کیا گیا ہے۔ موت کا ذکر ایسا مختصر اور جامع ہے کہ قاری موضوعِ خاکہ کے بارے میں متجسس ہو جاتا ہے۔ قاری موضوعِ خاکہ سے ہمدردی محسوس کرتا ہے اور اس کی حیات کے معاملات اور واقعات کو جاننا بھی چاہتا ہے۔ مولوی عبدالحق قاری کے کے جذبات کو کس طرح اُبھارتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

> "آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایک ایسے شخص کی موت جس سے دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی بہبودی وابستہ ہو، جس پر قوم کی رہبری اور سرداری کے لیے ملک کی نظرِ انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں ،ہزار حسرت وافسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔"(۴)

مولوی عبدالحق نے محمد عزیر مرزا کی ابتدائی زندگی اور علمی و ادبی زندگی کے واقعات کو ایک خاص ترتیب سے ان کے خاکے میں بیان کیا ہے مولوی عُزیر مرزا کے کارناموں کے ساتھ ان کی شخصی خوبیوں کا ذکر بھی کیا، مذہبی اعادات واطوار کو بھی بیان کیا۔ مولوی عبدالحق عُزیر مرزا کو ایک متقی اور پرہیز گار شخصیت کے طور پر قاری کے سامنے لائے۔ مولوی عبدالحق نے عزیر مرزا کی سیاسی وابستگی کا ذکر بھی کیا۔ اس بابت آپ کا اختصار توجہ کے قابل ہے ۔ آپ نے ایک دو سطروں میں عُزیر مرزا کی سیاسی زندگی کو بیان کر کے رکھ دیا۔ لکھتے ہیں کہ

> "آل انڈیا مسلم لیگ ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ان کے سکریٹری ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی۔ مرحوم نے اسے زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اس کے دائرہ افادہ کو وسیع کیا اور اہلِ کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یہ مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پُرزور آلہ ثابت ہوتے۔"(۵)

مولوی عبدالحق نے حکیم امتیاز الدین طبیب کے ساتھ ساتھ حکیم کہہ کر ان کو ایک عقل مند اور دانا شخصیت کے طور پر قاری کے سامنے رکھا ہے۔ حکیم امتیازالدین پیشے کے لحاظ طبیب ضرور تھے لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں ان کی دانائی اور عقل مندی لائقِ تحسین تھی۔ مولوی عبدالحق نے حکیم امتیازالدین کو اپنی ذات میں انجمن بتایا ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ ""وہ طبیب ہی نہ تھا حکیم بھی تھا اور یہی وجہ تھی کہ وقت پر وہ کام کر جاتا تھا جو بڑے بڑے حاذق طبیب اور ڈاکٹر نہ کر سکتے تھے"[۶] مولاناوحید الدین سلیمؔ کے خاکے میں مولوی عبدالحق نے مولانا کی زندہ دلی اور ظرافت کا ذکر کرتے ہوئے آپ کو نڈر کہا ہے۔ مولاناوحید الدین سلیمؔ کے خاکے میں ان کی جامعہ عثمانیہ کے لیے خدمات کا ذکر ہے اور جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ان کی بے تکلفی کو مختصراً بیان کیا ہے۔ آپ نے مولانا کے غیر معمولی حافظہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے مولانا کو علمی طور پر ایک قد آور شخصیت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے"[۷] مولوی عبدالحق نے مولاناوحید الدین سلیمؔ کے علمی کمال اور وابستگی کو نہایت خوب صورتی سے ایک ہی فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ اس ایک جملے سے قاری مولانا کی علمی مقام کا تعین کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی یہی خوبی ان کو دوسروں خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ موضوعِ خاکہ کے بارے میں ایسے مختصر اور جامع فقرات کا چناؤ کر کے صاحبِ خاکہ کو نکھارتے ہیں کہ قاری کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

مولانا محمد علی جوہر کی مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق نے محمد علی جوہر کی انگریزی راج سے نفرت کو بیان کیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا انگریزوں کے بارے میں نقطہ نظر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وہ آزاد ہندوستان کے بہت بڑے حامی تھے۔ آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اس وقت کے سیاسی رہنماؤں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ مولوی عبدالحق ان کے اس جذبہ آزادی کو بیانیوں بیان کرتے ہیں "وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر واستبداد کا پکّا دشمن تھا۔"[۸] اس ایک جملے میں مولوی عبدالحق نے مولانا محمد علی جوہر کی آزادی کی تڑپ کو بیان کر دیا ہے۔ آپ نے مولانا کی ساری سیاسی زندگی کو بیان نہیں کیا بلکہ ان کے خاکے میں ان کی سیاسی سوچ کو اختصار سے بیان کر کے قاری کو ان کی ذات کا ایک رُخ دکھا دیا اور باقی کا کام قاری پر چھوڑ دیا۔ مولوی عبدالحق نے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے جوڑے دوسرے اہم واقعات کو اختصار سے بیان کر کے ان کی تصویر کو مکمل کیا۔

شیخ غلام قادر گرامیؔ کے خاکے میں بھی اختصار کا عنصر موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے شیخ غلام قادر کے شعری ذوق کی تعریف کی ہے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور خاطر تواضع ان کی ذات کا اہم وصف تھا۔

شیخ غلام قادر اپنی دنیا میں گُم رہنے والے لوگ تھے۔ شاعری کے معاملے میں شیخ غلام قادر گرامیؔ بہت ہوشیار تھے مگر دنیاوی معاملات میں وہ بہت سادہ طبعیت کے مالک تھے۔ مولوی عبدالحق ان کی فارسی میں مہارت کو مختصراً بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ہندی نژاد تھا مگر فارسی کا استاد تھا۔"[۹] مولوی عبدالحق نے شیخ غلام قادر کی فارسی میں مہارت اور محاورہ فارسی کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔ شیخ غلام قادر کا کلام اُستادوں کا کلام تھا اور وہ اپنے کلام کو خوب سنوارتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے شیخ غلام قادر کے خاکے میں فارسی زبان کی برصغیر میں تنزلی کا ذکر کیا ہے۔ شیخ غلام قادر گرامیؔ جیسے ماہر فارسی دانوں کی وفات سے اس فارسی کو نا قابلِ تلافی نقصان ہوا۔ مولانا الطاف حسین کی خاکہ نگاری میں بھی مولوی عبدالحق نے اختصار کے پہلو کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے ورنہ مولانا جیسی ہمہ جہت شخصیت کے ایک پہلو کے احاطہ کے لیے شاید کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کے خاکے میں ان سے اپنی ملاقات اور مولانا کی مصروفیات کو مختصراً بیان کیا۔ مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کے شخصی اوصاف کو قاری کے سامنے کس قدر اختصار سے بیان کیا ملاحظہ فرمائیں:

> "مجھے اپنے زمانے کے نامور اصحاب اور اپنی قوم کے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالیؔ جیسا پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک نہیں ملا۔"[۱۰]

مولانا حالیؔ کے بیان میں مولوی عبدالحق نے ان کے شخصی اوصاف اور خصائص کو مختصر مگر جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ آپ نے چند لائنوں مولانا حالیؔ کی پوری شخصیت کو قاری کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ خاکساری اور خلوص کا جذبہ مولانا حالیؔ میں بہت زیادہ تھا ہر چھوٹا بڑا ان کا احترام کرتا تھا۔ آپ کو ملنے والا ہر انسان آپ کا مداح بن جاتا تھا۔ مولوی عبدالحق نے جن لوگوں کی خاکہ نگاری کی ان کی شخصیت کے تمام پہلو قارئین کے سامنے رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ آپ نے اس ضمن میں خاکہ نگاری کے بنیادی لوازم کو پیشِ نظر رکھا۔ آپ نے واقعات کے انتخاب میں اور ان کے بیان میں حد درجہ احتیاط سے کام لیا۔ جن واقعات کو طوالت سے بیان کرنا ضروری تھا، بیان کیا اور جہاں اختصار سے کام چل سکتا تھا، اختصار سے کام لیا۔ یوں آپ نے اپنے خاکوں میں اختصار اور جامعیت کے عنصر سے موضوعِ خاکہ کی ایک جامع تصویر قاری کے سامنے رکھ دی۔ قاری مولوی عبدالحق کے خاکوں کو پڑھتے ہوئے تشنگی محسوس نہیں کرتا۔

سراپا نگاری

سراپا نگاری، خاکہ نگاری کا ایک جزو ہے۔ ایک ایسا جزو جس کا ہونا خاکے کے حسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے لیکن اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو سراپا نگاری کے بغیر بھی خاکہ لکھا جا سکتا ہے۔ سراپا نگاری خاکے کا جزو ہے کل نہیں۔ اگر ایک خاکہ نگار اپنے خاکے میں سراپا نگاری کو شامل کرتا ہے تو اس سے اُس کے لکھے گئے خاکے سے قاری زیادہ لطف اندوز ہو گا۔ کیونکہ اس طرح قاری موضوعِ خاکہ کے ظاہری حلیہ اور وضع قطع سے روشناس ہو کر اس کی شخصیت کے چُھپے ہوئے پہلوؤں سے آگاہی کی کوشش کرے گا۔ ڈاکٹر صابرہ سعید خاکہ نگاری میں سراپا نگاری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> "جب تک خاکہ نگار شخصیت کا ظاہری عکس یا اور حلیہ اور وضع قطع پیش نہیں کرتا قاری اس سے متعارف نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے بغیر کسی شخصیت کا تصور ذہن قبول نہیں کرتا۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ اگر دوستی کی بنیادیں جسمانی موجودگی یا عکسِ تصویر کے بغیر استوار کی جائیں تو ایک گہرے دوست کے لیے دوسرے دوست کو پہچاننا تو کجا یاد رکھنا بھی آسان نہیں ہوتا"(۱۱)

ڈاکٹر صابرہ سعید کے مطابق قاری کا موضوعِ خاکہ کے ظاہری عکس اور حلیہ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس طرح قاری موضوع خاکہ سے جلد متعارف ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں خاکہ نگار کا کام بھی کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک خاکہ نگار کو شخصیت کے خط و خال، عادات و اطوار اور دوسرے امتیازی خصائل کا مشاہدہ بہت گہرائی سے کرنا پڑتا ہے تاکہ اگر کسی جگہ پر موضوعِ خاکہ قاری کو مل جائے تو وہ اس کو فوری طور پر پہچان لے۔

ایک خاکہ نگار موضوعِ خاکہ کی سراپا نگاری میں اس کے حلیے کے ساتھ اس کی دوسری صفات کو بھی بیان کرتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خاکہ نگار موضوعِ خاکہ کی سچی کردار نگاری کے لیے اپنے سماجی اور اخلاقی تصورات کو پرے رکھ کر اس کی حقیقی تصویر کو اُجاگر کرے۔

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں سراپا نگاری کی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ چند ایک خاکوں میں مولوی عبدالحق نے اپنی ممدوح شخصیت کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے شخصیت کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے اس کی تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق ان خاکہ نگاروں میں شامل ہیں جو صورت کی بجائے سیرت کے ذریعے شخصیات کو قاری کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ نے شخصیت کے متعلق اہم

واقعات کے کو بیان کر کے موضوعِ خاکہ کا قاری سے تعارف کروایا ہے۔ پروفیسر حیرت مرزا کی خاکہ نگاری میں مولوی عبدالحق نے ان کی شخصی اوصاف کو بیان کر کے ان کی تصویر کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "مرزا حیرت کی ایک شے اعلا درجے کی تھی۔ ان کا دماغ، حافظہ، ان کی قوتِ مشاہدہ، ان کی فیاضی سب غیر معمولی تھی۔"(۱۲)

مولوی عبدالحق نے حیرت مرزا کا حلیہ تو بیان نہیں کیا لیکن کمال مہارت سے ان کے شخصی اوصاف کے ذریعے قاری کے دل و دماغ میں حیرت مرزا کا ایک عکس بٹھا دیا۔ مولوی عبدالحق نے پروفیسر حیرت مرزا کے غیر معمولی حافظہ اور فیاضی کو بیان کر کے اُن کے ساتھ ہمدردی اور رشک کے جذبات کو اُبھارا۔

مولوی چراغ علی کے خاکے میں بھی مولوی عبدالحق نے ان کی ذاتی خوبیوں سے ان کی تصویر بنائی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ذاتی اوصاف بھی کسی شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ شخصیت کا ایک عکس قاری کے سامنے رکھنے کے لیے خاکہ نگار کو یا تو حلیہ بیان کرنا پڑتا ہے یا پھر شخصی اوصاف کے ذریعے قاری سے اس کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ ادیب اور شعراء منفرد مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان کی اس انفرادیت کو اُن کی ذات کا حصّہ بنا کر قاری کے سامنے رکھا۔ مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بے کار ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت مین کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زاہد باتوں سے انھیں طبعی نفرت تھی۔"(۱۳)

ایک کم گو، خاموش طبیعت جو وقت کی بہت زیادہ قدر کرتا ہے اور مطالعہ اور غور و فکر میں مگن رہتا ہے۔ لوگوں سے میل ملاپ اور فضول گفتگو سے جس کو نفرت ہو، اُس کی شخصیت کیسی پُر وقار اور عظیم ہو گی۔ مولوی عبدالحق نے مولوی چراغ علی کے عادات و خصائل کے بیان سے قاری اور مولوی چراغ علی کی اجنبیت کو ختم کیا ہے۔ مولوی عبدالحق شخصی اوصاف بیان کرنے کے بعد آگے چل کر باقاعدہ طور پر مولوی چراغ علی کی سراپا نگاری بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے۔ چہرے سے ان کے رُعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھر کم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں، اور دیکھنے سے

رعب اور اثر پڑتا تھا۔ ان کے اکثر ہم اثر اور ہم رتبہ لوگ ان کا بہت احترام اور بہت ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں ۔اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل وصورت کے لوگوں پر ان کے علم وفضل اور قابلیت کا بھی رُعب تھا۔"(۱۴)

مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری میں چہرہ نویسی کی تکنیک کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ مولوی چراغ علی کے خاکے میں بھی آپ نے چہرہ کو بیان تو کیا ہے لیکن مکمل سراپا نگاری کی جھلک نظر نہیں آتی۔ مولوی عبدالحق نے عادات وخصائل سے ہی چراغ علی کو بیان کیا۔ حلیہ آپ کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ مولوی عبدالحق بہت ہی سادگی، دانائی اور خلوص کے ساتھ اپنے ہم عصروں کے حالات کو تحریر کیا۔ آپ نے شخصیت کا بغور مشاہدہ کیا پھر الفاظ سے ایسی تصویر بنائی جو حقیقت کے بہت قریب ہو۔ آپ کے بیان کردہ شخصی محاسن کو جان کر قاری موضوعِ خاکہ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق ایسے جملے استعمال کرتے ہیں جن کی بدولت قاری موضوعِ خاکہ کے سحر میں مبتلا ہو کر خود سے ہی اُس کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بِٹھالیتا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کے خاکے میں مولوی عبدالحق ان کی شخصی اوصاف کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا ان تھک ہو۔ وہ پرلے درجے کے ذہین اور ذکی تھے وہ ہمیشہ علمی معاملات میں گفتگو کرتے۔"(۱۵)

مولوی عبدالحق نے خواجہ غلام الثقلین کے علمی شغف اور ذہانت کو ان کی شخصیت کا جزو قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے خواجہ غلام الثقلین کی گہری علمی وابستگی کو بیان کر کے قاری کے ذہن میں ایک پڑھی لکھی اور پُر وقار شخصیت کا کا عکس بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مولوی عبدالحق خاکہ لکھتے وقت یہی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ امتیازی اوصاف کو بیان کر کے موضوعِ خاکہ کی شخصیت کو اُبھارا جائے۔ ہر شخصیت کی کچھ خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں جو شخصیت کے مزاج کی تشکیل کرتی ہیں۔ مولوی عبدالحق ایسے خاکہ نگار ہیں جو مزاج اور طبعیت کے بیان سے شخصیت کو سامنے لاتے ہیں۔ گدڑی کا لال-نور خان کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے نور خان کے مزاج اور طبیعت سے اُس کی شخصیت کو آشکار کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"خان صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر ہوتی تھی، وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور

فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔"(۱۶)

مولوی عبدالحق نے نور خان کی شخصیت کو ہشاش بشاش اور زندہ دل قرار دیا ہے اور وہ ان خصوصیات کی وجہ سے معاشرے ہر طبقے میں مقبول تھا۔ نور خان کے خاکے میں بھی مولوی عبدالحق نے موضوعِ خاکہ کو شخصی خوبیوں سے اُجاگر کرتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔ زندہ دلی اور خوش طبعی انسان کو ہر فکر سے آزاد رکھتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کو خوش رکھتے ہیں وہ خود بھی ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ نام دیو مالی کے خاکے میں بھی مولوی عبدالحق اُس کی محنت اور لگن سے نام دیو کا سراپا بیان کیا ہے۔ قاری نام دیو کو اُس کی محنت اور لگن سے ہی پہچانتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نام دیو کو ایک سادہ اور منکسر المزاج شخص بتایا ہے۔ اُس کے چہرے کی بشاشت اور لبوں کی مسکراہٹ کو بیان کر کے قاری کو ایسی شخصیت سے روشناس کرایا ہے جو اپنے فن میں یکتا تھا۔ مولوی عبدالحق نام دیو کے سراپا کو یوں بیان کرتے ہیں

"وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"(۱۷)

مولوی عبدالحق نے چہرہ نویسی کی بجائے شخصی اوصاف کے ذریعے سے موضوعِ خاکہ کو قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ آپ کا یہ منفرد انداز آپ کو دوسرے خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ چہرہ نویسی خاکے کا جزو ہو سکتی ہے لیکن اگر مولوی عبدالحق کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے شخصی اوصاف کے ذریعے سراپا کو بیان کیا جائے تو بھی ایک بہترین خاکہ لکھا جا سکتا ہے اور اس کی واضح مثال مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری ہے۔ شخصی اوصاف کسی بھی شخصیت کی ایک بہترین تصویر بناتے ہیں۔ قاری حلیہ سے اتنا مرعوب نہیں ہوتا جتنا وہ شخصی اوصاف سے ہو گا۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں اس تکنیک کو بھرپور انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔

اُسلوب

خاکہ نگاری میں اُسلوب کی بہت اہمیت ہے۔ اُسلوب میں اندازِ مکالمہ اور زبان و بیان سے خاکہ نگار اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے شخصیات کو بیان کرتا ہے۔ کسی بھی ادبی صنف کو پرکھنے کے لیے اس کے اُسلوب کو

ضرور دیکھا جاتا ہے۔ خاکے میں بھی خاکہ نگار کے اُسلوب کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خاکے کے اُسلوب میں شگفتگی اور شائستگی ہو گی، اس میں حقائق کا بیان ہو گا، زبان و بیان میں سلاست اور سادگی ہو گی تو خاکہ جہاں خاکہ نگار کے ادبی ذوق کی ترجمانی کرے گا وہاں خاکے کی صحت پر بھی کوئی اُنگلی نہیں اُٹھ سکے گی۔ ایک خاکہ نگار کے اُسلوب کا حُسن یہ ہے کہ وہ صاحبِ خاکہ کی خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں خود کو غیر جانبدار رکھے اور اگر کوئی خامی بیان کرے تو اُس کا انداز ایسا ہو کہ قاری صاحبِ خاکہ سے نفرت محسوس نہ کرے اور اسی طرح خوبیوں کا بیان ایسا نہ ہو کہ موضوعِ خاکہ فرشتہ نظر آئے۔ خاکے میں شگفتگی اور دل چسپی کا عنصر بھی اُسلوب سے تعلق رکھتا ہے۔ دل چسپی کا عنصر لازم ہے، ہاں مزاح کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ خاکہ نگار کا کام صاحبِ خاکہ کے اہم پہلوؤں کو آشکار کرنا ہوتا ہے نہ کہ اُس کی مزاحیہ کردار نگاری کرنا ہوتی ہے۔ اُسلوب کا سب سے اہم پہلو کم الفاظ میں شخصیت کو نمایاں کر کے پیش کرنا ہیں۔ خاکہ نگاری میں ایک خاکہ نگار ایک ہی شخصیت کو مختلف زاویوں سے بیان کرتا ہے۔ حلیہ نگاری، پیکر تراشی اور کردار نویسی کے ذریعے شخصیت کی تصویر کو اُبھارتا ہے۔ اس ساری تصویر کشی میں اُسلوب بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے اُسلوبِ بیان کے متعلق نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

> "وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ اسٹائل کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اُن کا اسٹائل اظہار وابلاغ کے لیے بہت موثر ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بھرپور لفظوں بے تکلف کہہ دیتے ہیں اور یہی اسٹائل کا مقصد و منتہیٰ ہے۔"(۱۸)

ادیب کی اپنے اُسلوب کی بدولت ہی قارئین تک رسائی ہوتی ہے اور اُسلوب کے زور پر ہی ادب اُن کے ذہنوں کو مطمئن کر کے اُن کو آسودگی بخشتا ہے۔ اُسلوب دراصل مصنف کی دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز کا نام ہے جس کی وجہ سے ہر جملہ اثر انگیز ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا اُسلوب نرالا اور انوکھا نہیں ہے نہ ہی آپ کے اُسلوب کو رنگین اور دقیق کہہ سکتے ہیں۔ ہاں اس کو سادہ اور سلیس نہ کہنا ناانصافی ہو گا۔ درحقیقت مولوی صاحب کا اُسلوب ایسا تھا جو خاص و عام کو پسند تھا۔ ڈاکٹر ثمینہ مولوی عبدالحق کے اُسلوب کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

> "مولوی صاحب کے اُسلوب کا نمایاں پہلو، بول چال کی زبان کے عناصر کا آزادانہ اور شگفتہ استعمال ہے لیکن وہ قصداً اس کے مواقع پیدا نہیں کرتے۔ اُن کا جمالی ذوق جب بلند ہوتا ہے تو وہ الفاظ اور ترکیبوں کو بڑے شاطرانہ انداز میں برت جاتے ہیں

۔اس طرح ان کی سادگی میں پُرکاری اور پُرکاری میں سلاست، سلاست میں رنگینی
وبے تکلفی اور بے تکلفی میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔"(۱۹)

مولوی عبدالحق کے اُسلوبِ بیان کی یہ خوبی ہے کہ وہ صاحبِ خاکہ کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتے ہوئے کسی جھجک کا شکار نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں وہ موضوعِ خاکہ سے اپنے تعلقات اور عظمت اور شہرت کو بھی پرے رکھ دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک حقیقت اہم ہوتی ہے اور وہ حقیقی عکس کو پیش کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔ مولانا محمد علی کی خاکہ نگاری میں اُن کے معائب اور محاسن کو بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہیں ہو گا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔ وہ انگریزی ادب کا بہت بڑا ادیب ،زبردست انشاپرداز اور اعلا درجہ کا مقرّر تھا، لیکن لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اُوجھل ہو جاتے تھے۔ اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔"(۲۰)

درج بالا اقتباس میں مولوی عبدالحق نے مولانا صاحب کے دونوں شخصی پہلو قارئین کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بیان کر کے قاری کو حقیت سے مکمل آگاہی دی ہے اور اس بابت مولوی عبدالحق نے مولانا سے اپنے تعلقات کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ ایک خاکہ نگار کے اُسلوب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ صاحبِ خاکہ کی حقیقی تصویر کا قاری کے سامنے لاتا ہے۔ اگر وہ اپنے ذاتی تعلق کی بنا پر صاحبِ خاکہ کی پردہ پوشی کرے گا تو حقیقت آشکار ہونے پر قاری خاکہ نگار اور ممدوح شخصیت دونوں سے بدظن ہو گا۔ سادگی اور سلاست بھی مولوی صاحب کے اُسلوب کی پہچان ہے۔ آپ نے عربی اور فارسی کے مشکل اور دقیق الفاظ کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے شخصیات کے بیان میں سلیس انداز کو اپنایا ہے۔ آپ کے اُسلوب کی سادگی اور سلاست آپ کی خاکہ نگاری میں جابجا ملتی ہے۔ نام دیو کے خاکے میں ملاحظہ فرمائیں:

"وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں کو ہی اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ

ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جُھک جُھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چُپکے چُپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔"(۲۱)

یہاں مولوی عبدالحق نے نام دیو کی خوبیوں کا ذکر نہایت سادگی اور روانی سے کیا ہے۔ آپ کی تحریر کی یہ خوبی صاحبِ خاکہ کا دلکش تصوّر قاری کے ذہن بٹھاتی ہے۔ قاری خاکہ کو پڑھتے ہوئے تحریر میں کھو سا جاتا ہے۔ آپ نے مشکل پسندی سے مکمل اجتناب کیا ہے۔ اُسلوب کی سادگی اور روانی مولوی عبدالحق کو دوسرے خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں طنز و مزاح بہت کم ہے۔ طنز و مزاح سے شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور اس ضمن میں بھی مولوی صاحب نے اپنی روایتی متانت کا دامن نہیں چھوڑا۔ مولوی سیّد علی حسن بلگرامی کے خاکے میں آپ نے اُن کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا بھرپور احاطہ کیا ہے اور ان کی مذہبی فکر و سوچ کو بھی بیان کیا ہے اور یہ سارے کا سارا بیان بہت ہی سنجیدہ ہے لیکن ساتھ ہی آپ نے شگفتہ انداز کو اپناتے ہوئے خاکے میں مزاح کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس شگفتہ انداز سے خاکہ مزید دلچسپ ہو گیا ہے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چناں چہ اسی زمانے میں جب کہ وہ "تمدنِ ہند" کا ترجمہ کر رہے تھے انھوں نے اپنے دوست کو دو باب سُنانا شروع کیا جس میں دراوڑی قوم (جو ہندوستان کی ایک قدیم وحشی قوم تھی) کا ذکر تھا، جب مرحوم پڑھنا ختم کر چکے تو اس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔"(۲۲)

مولوی عبدالحق انسانی عظمت کی پہچان رکھتے تھے۔ آپ کو جہاں کہیں بھی انسانیت، ہمدردی، محبت و شرافت کی خوبی نظر آئی اس کو اپنے اُسلوب کی مٹھاس سے بیان کر کے خاکے میں جان ڈال دی۔ بظاہر عام سی بات یا واقعے کو آپ نے اپنے اُسلوب کے زور پر ایسا پُر اثر بنایا کہ پڑھنے والا مسحور ہو رہ جاتا ہے۔ آپ نے محبت و الفت اور بُغض و کینہ کے جذبات سے عاری ہو کر شخصیات کے اوصاف و رذائل پر بے لاگ تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحبِ خاکہ کی سیرت کو کمال فن کاری سے پیش کرتے ہیں۔ الفاظ کے

ذریعے تحریر میں حسن پیدا کرنا آپ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ مولوی عبدالحق مکالمات اور واقعات کو بیان کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے جملوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے بیانیہ اُسلوب سے موضوعِ خاکہ کی ایک متحرک تصویر قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان سادہ اور محاورات محل کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ مولوی چراغ علی کے خاکے میں آپ کے جملوں کی سادگی کی ملاحظہ فرمائیں:

"تحقیق اور تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہہ تک پہنچتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کے سُراغ میں پتّے پتّے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔"(۲۳)

مولوی عبدالحق کے خاکوں میں ان کے منفرد اُسلوبِ بیان کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ الفاظ کی لمبی قطاریں نہیں باندھتے اور نہ ہی مترادف الفاظ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ موضوعِ خاکہ کی ذات کو بیان کرتے ہوئے کسی جوش و خروش کا شکار بھی نہیں ہوتے ہاں قاری کے جذبات کو ضرور اُبھارتے ہیں۔ پروفیسر حیرت مرزا کے خاکے میں آپ نے ان کی شخصیت کو متعارف کراتے ہوئے قاری کے جذبات کو کس طرح اُبھارا ملاحظہ فرمائیں:

"وہ شہرت پر لات مار کر کنجِ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ اور خیالات میں خواہ وہ بادِ ہوائی ہی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو اس "ضعف" کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو ایک غلام یا بیل اور گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی "ہاہا" اور چند سمجھ داروں کی "واہ واہ" کے لیے کاغذ کو سیاہ اور اپنے لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے۔"(۲۴)

مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری میں شخصیات سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ ممدوح شخصیات آپ کے خاکوں میں بولتی، ہنستی اور جھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ حکیم امتیاز الدین کے خاکے میں اُن کی بیان کرنے کے لیے آپ نے جو اُسلوب اپنایا ہے وہ بہت ہی زیادہ دلکش ہے۔ سارے کے سارے بیان میں مولوی صاحب کی اُن سے محبت اور عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ حکیم امتیاز الدین کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اوصاف کو کس دلکش اُسلوب میں بیان کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

"ہمارا بے مثل دوست 'حکیم' مر گیا۔ افسوس صد افسوس! وہ اپنے فن اور رنگ میں

ایک تھا۔ اگرچہ طبعیت کا کمزور اور لاُبالی تھا مگر دوستی کا سچّا اور دُھن کا پکّا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا۔ مگر خیال میں اس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثال بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہا درجے کی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی تھی۔ میانہ روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔ قدامت اور جدت عجب طرح سے اس کے مزاج میں میں سموئی تھی۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پرانے لوگ اس کی گرد کو نہ پہنچ سکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اس کے آگے ماند تھے۔"(۲۵)

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا اُسلوب منفرد نوعیت کا ہے۔ تحریر میں سادگی اور بے ساختگی ہے اور آپ اپنے خیالات اور افکار کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بات دل کو لگتی ہے۔ آپ کسی بھی بات کو سپردِ قلم نہیں کرتے جب تک کہ اس کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔

سیّد محمود کے خاکے میں مولوی عبدالحق نے سیّد محمود کی شخصیت کو بیان کرتے ان عمومی زندگی کا احوال بھی بیان کیا ہے۔ سیّد محمود کا سارا خاکہ واقعاتی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اُسلوب کی سنجیدگی کی ایک جھلک سّید محمود کے خاکے میں نظر آتی ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"وہ ایک پارسا صفت درویش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وہ خواجہ حافظؔ کی غزلیں، قطعات ابنِ یمین اور عمر خیام کی رباعیات پڑھتا اور مزے لیتا حتّٰی کہ اس پر عمل بھی کرتا۔ وہ اپنی ضروریات یعنی کھنا پینا، سونا، لباس وغیرہ جس پر ہم لوگوں کا بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ صَرف ہوتا ہے کچھ پروانہ کرتا اور بے تکلف یہی سادہ زندگی بسر کرتا جس میں نہ نئے فیشن کو دخل تھا اور نہ پرانی وضع کا زور چلتا تھا، مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پرواتھا اسی قدر وہ اخلاق میں مُستثنیٰ تھا۔"(۲۶)

مولوی عبدالحق کے اُسلوب کی ایک اور خاص بات ان کی مُدعانویسی ہے۔ وہ غیر ضروری باتوں اور فقرات کو اپنی تحریر کا حصّہ نہیں بناتے۔ تصنع اور بناوٹ آپ کے ہاں بالکل نظر نہیں آتی، مقصد کی بات کرتے ہیں تاکہ قاری موضوعِ خاکہ کی زندگی کے اہم پہلوؤں سے آشنائی حاصل کر سکے۔ مولانا وحید الدین سلیمؔ کے خاکے میں مولوی صاحب نے اُن کی شخصیت کو بہت جچے تُلے الفاظ سے نوازا ہے۔ غیر ضروری تفاصیل کی بجائے مولانا کی علمی وابستگی کو بیان کر کے ان کی شخصیت کو اُجاگر کیا ہے۔ مولانا کی علمی وابستگی کو بیان کرنے

کے لیے آپ نے جو اُسلوب اپنایا وہ اس قدر جاندار ہے کہ قاری مولانا وحید الدین کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

> "اُن جیسا ادیب سارے ملک میں نظر نہیں آتا۔ وہ جامع حیثیات شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے۔ اردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی۔ خاص کر نئے الفاظ بنانے میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی کتاب "وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعتِ نظر اور تبحّر کی شاہد ہے۔ وہ اعلا درجہ کے نثار تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شاعری ان کے زورِ طبیعت کا نتیجہ تھی، بعینہ جیسی مولوی نذیر احمد کی شاعری، لیکن "سلیم" مرحوم ان سے سبقت لے گئے تھے۔ ان کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔"(۲۷)

مذکورہ بالا اقتباس میں مولوی عبد الحق نے آسان الفاظ میں مولانا وحید الدین سلیمؔ کے علمی مقام اور خدمات کو بیان کیا ہے۔ آپ نے بالکل سادہ اور سلیس انداز کو اپناتے ہوئے قاری کو اپنا مدعا بیان کیا۔ ان چند سطروں کو پڑھنے کے بعد قاری مولانا وحید الدین سلیمؔ کے علمی مقام کا خود سے تعیّن کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ سب مولوی صاحب کے اُسلوب کی خوبی ہے جس کے ذریعے وہ انتہائی اختصار سے موضوعِ خاکہ کو کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ مولوی عبد الحق نے اپنی خاکہ نگاری میں محاورات اور دقیق الفاظ کو بہت کم جگہ دی ہے۔ آپ نے بالکل عام فہم اور سادہ الفاظ سے شخصیات کی مرقع کشی کی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے خاکوں کو مقبولیتِ عام کا درجہ ملا۔ مولوی عبد الحق کے اُسلوب میں ہمدردی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ مولوی صاحب کا طرزِ بیان شگفتہ ہے ان کے جملوں میں اختصار پایا جاتا ہے، ان کی عبارت جھول سے پاک ہے، الفاظ کی جامعیت اور صحیح استعمال آپ سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ نے خاکہ نگاری میں ٹھیٹ زبان کا استعمال کیا اور عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے ممکن حد تک اجتناب کیا۔ آپ نے شخصیات پر بے لاگ تبصرے کیے اور الفاظ کی مدد سے شخصیات کی قلمی تصویریں بنا کر ان میں اپنے اُسلوب سے روح ڈال دی۔

واقعات نگاری

واقعات نگاری سے مراد واقعات کا بیان ہے۔ خاکہ نگاری واقعات نگاری کے بغیر ممکن نہیں۔ صرف شخصی اوصاف کو بیان کر کے کسی شخصیت کی مکمل تصویر کشی ممکن نہیں۔ اس کے لیے ایک خاکہ نگار صاحبِ خاکہ کو واقعات کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں خاکہ نگار کا کام کافی مشقت طلب ہوتا ہے۔ کسی

بھی شخصیت سے متعلق واقعات کا ایک انبار اس کے سامنے ہوتا ہے۔ ایک ماہر خاکہ نگار ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو صاحبِ خاکہ کی شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ واقعات کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے کیونکہ غیر ضروری واقعات سے شخصیت کے متاثر ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ خاکے کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے خاکہ نگار کو چاہیے کہ وہ صرف ان واقعات کو خاکے کا حصّہ بنائے جن کا وہ عینی شاہد ہو یا پھر ان واقعات کو جن کی سچّائی پر اُسے یقین ہو۔ ایک خاکہ نگار کے لیے ایک واقعہ نگار ہونا بھی ضروری ہے اس طرح واقعات خاکے میں دل چسپی کے عنصر کو بڑھاتے ہیں۔ واقعہ کے بیان میں خاکہ نگار کو واقعہ کے وقت اور مقام کا پتا ہونا چاہیے۔ اگر خاکہ نگار واقعہ اور اس سے جوڑے ماحول کی عکاسی درست انداز میں کرے گا تو ہر چیز مکمل صورت میں اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ ایک ماہر خاکہ نگار واقعات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ قاری واقعات کو بالکل اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتا محسوس کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی خاکہ نگاری کرتے ہوئے شخصیات سے متعلق مختلف واقعات کو بیان کیا ہے چونکہ مولوی عبدالحق نے اپنے معاصرین کی خاکہ نگاری کی ہے اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ جو واقعات مولوی صاحب نے بیان کیے ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہوں گے۔ آپ نے خاکہ نگاری میں واقعات کو ایک منظم انداز سے بیان کیا ہے۔ واقعات کی یہ خاص ترتیب صاحبِ خاکہ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرتی جاتی ہے اور قاری اپنی پسندیدہ شخصیت سے روشناس ہو جاتا ہے۔ پروفیسر حیرت مرزا کی خاکہ نگاری میں مولوی صاحب نے ان کی سیاحتِ ایران، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ کا ذکر کیا ہے۔ قسطنطنیہ قیام کے بعد ان کا مصّمم ارادہ تھا کہ وہ عرب کے مقدس مقام سنّا میں مقیم ہو کر درویشانہ اور صوفیانہ زندگی بسر کریں گے مگر ان کے ساتھ کیا ہوا مولوی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "جب وہ عدن پہنچے تو جنگِ کریمیا زوروں پر تھی۔ یہ ایک کشتی کے انتظار میں تھے۔ دفع الوقتی کے خیال سے انھوں نے وہاں فصیلوں اور قلعوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک ایک شے کو اس غور اور گہری نظر سے دیکھ رہے تھے کہ سنتریوں کو شبہ ہوا اور روسی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی زبانوں کے پورے ماہر، جو کچھ انہوں نے کہا کسی نے یقین نہ کیا۔ اور جب بیان کیا کہ میرا ارادہ گوشہ نشینی اور درویشانہ زندگی بسر کرنے کا ہے تو ان کا شبہ اور بڑھ گیا اور انھیں مجبوراً اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور زندگی کے اس نظر فریب پہلو

سے بال بال بچ گئے اور بحالت نظر بندی انگریزی رجمنٹ کی معیت میں بلگام پہنچائے گئے۔"(۲۸)

اس واقعہ نے مرزا حیرت کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا اور وہ ایک درویش ،صوفی بننے کی بجائے انگریزی کالج میں پہنچ گئے۔ مولوی عبدالحق اس واقعے کو مرزا حیرت کی زندگی کے ایک انقلاب انگیز واقعہ قرار دیا ہے۔اس واقعے کے بیان میں میں مولوی صاحب نے مرزا حیرت کے انتظار ، سنتریوں سے ان کے مکالمات اور ان کی گرفتاری کی دل کش انداز میں منظر نگاری کی ہے۔اگر مولوی عبدالحق اس واقعے کو مرزا حیرت کے خاکے میں شامل نہ کرتے تو اُن کی زندگی میں آنے والے انقلاب سے قاری بے خبر رہتا۔ شمس العلماء مولوی سیّد علی بلگرامی کی خاکہ نگاری میں بھی مولوی صاحب نے ان کی شخصیت سے جوڑے اہم وقعات کو بیان کیا ہے۔ یہ واقعات ان کی شخصیت کو سمجھنے میں ممد ومعاون ہیں۔ مولوی عبدالحق نے سیّد علی کی علمی و ادبی خدمات کے واقعات کو خصوصی طور پر پیش کیا ہے جس سے آپ کی فکر اور سوچ نمایاں ہوتی ہے۔ مولوی سیّد علی بلگرامی نے اپنی علمی خدمات کے عوض بہت سے وظائف اور انعامات حاصل کیے۔ مولوی عبدالحق نے خاص طور پر سیّد علی کی ان کامیابیوں کو بیان کرکے ان کی شخصیت کو قاری کے سامنے پیش کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"مرحوم جب نواب سر وقارالامراء بہادر مرحوم کے ساتھ شملے تشریف لے گئے تو مولوی سیّد احمد مؤلف "فرہنگِ آصفیہ "نے اپنی تالیف 'ارمغانِ دہلی' کے بعض اجزاء پیش کیے۔مرحوم نے ان کی بہت تعریف کی اور سفارش کرکے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرادیا اور انعام کے لیے خود سفارش لکھ کر سرکار میں پیش کر دی۔ سرکارِ عالی سے بعد ازاں مؤلف کو گراں قدر انعامات عطا ہوئے۔"(۲۹)

درج بالا اقتباس میں مولوی عبدالحق نے مولوی سیّد علی کے عمائدینِ حکومت سے تعلقات کا واقعہ بیان کیا ہے۔ عمائدینِ حکومت نے آپ کی خدمات کا اعتراف کیا اورآپ کی اعانت اور دل جوئی بھی کی۔اس واقعے سے مولوی عبدالحق نے قاری کو یہ بات باور کرائی کہ مولوی سیّد علی اپنی علمی ،ادبی خدمات کی وجہ سے مقتدر حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔یہی وجہ تھی وقارالامراء ان کو اپنے ساتھ شملہ لے کے گئے اور جب انھوں نے اپنا کام ان کے سامنے رکھا تو نہ صرف خود ستائش کی بلکہ سرکار سے بھی انعام کی سفارش کر دی۔ یہ واقعہ مولوی سیّد علی بلگرامی جیسی قد آور علمی شخصیت کو قاری کے سامنے مزید نمایاں کرتا ہے۔

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی خاکہ نگاری میں مولوی عبدالحق نے اپنی ذاتی معلومات کی بناپر ان کے زمانہ طالب علمی کا احوال بیان کیاہے۔ مولوی صاحب خواجہ غلام الثقلین کی ذہانت اور جرات کے معترف ہیں۔ آپ نے ان کی سیاسی مصروفیات کا ذکر بھی کیاہے اور آپ کی کامیابیوں کو بھی بیان کیاہے۔ خواجہ غلام الثقلین کام کے دھنّی تھے وہ جس کام کا ارداہ کر لیتے اُس کو پورا کر کے چھوڑتے۔ کچھ اسی طرح کی اُمید وہ دوسروں سے بھی لگا لیا کرتے تھے لیکن جب ایسا نہ ہوتا تو بہت مایوس ہوتے۔ اسی مایوسی نے ان کو ایک بار ہندوستان سے ہجرت پر بھی مجبور کر دیا۔ مولوی عبدالحق نے اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیاہے:

"ناکامیوں اور ناکامیابیوں نے انھیں ایک بار ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ وہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرتے ہوئے ایران پہنچے۔ وہاں بھی وہ خاموش نہ رہے اور انھوں نے ملکی اصلاح کا ڈول ڈالا۔ وہاں کے مشہور لوگوں سے ملے، تقریریں کیں، اصلاحِ ملک پر بحثیں کیں، لیکن اس ایران کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ لہذا انھیں مجبوراًلوٹنا پڑا اور اگرچہ وہ مایوس ہو گئے تھے مگر وہ زیادہ مضبوط ہو کر آئے تھے۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے دُگنی اور چوگنی قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔"(۳۰)

مولوی عبدالحق نے خواجہ غلام الثقلین کو اس واقعے سے ایک اُولوالعزم شخصیت کے طور پر سامنے لائے ہیں جو حالات کی سنگینی سے بالکل بھی نہیں گھبرایا اور ہمہ تن گوش اپنے مقصد کے حصول میں شوق اور مستعدی سے لگا رہا۔ گدڑی کا لال۔نور خان بھی مولوی عبدالحق کا وہ خاکہ ہے جس میں مولوی صاحب واقعات کی مدد سے نور خان کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ اس خاکے میں آپ نے بیانیہ انداز کو اپناتے ہوئے اُن تمام واقعات کو بیان کر دیا جو آپ کے آنکھوں دیکھے تھے۔ آپ نے نور خان کی فوج میں بھرتی ،اس کی خود داری، سچائی، فرض شناسی، مستعدی اور خوش تدبیری کو بیان کیاہے۔ آپ نے بیان کردہ تمام خصوصیات سے جوڑے واقعات کو بیان کر کے نور خان کی شخصیت کا مثبت رخ قارئین کی نظر کیاہے۔ مولوی عبدالحق نے نور خان کی خود داری کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

"ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خان صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انھوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سُنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر

کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی شاخ میں اٹکا کر اندر چلا گیا۔"(۳۱)

درج بالا واقعہ نور خان کی خوداری کی ایک مثال ہے۔ جو شخص بھی اپنے کام کا ماہر ہو گا اور اپنے فرائض منصبی سے آگاہ ہو گا وہ یقیناً نڈر ہو گا۔ مولوی عبدالحق نے نور خان کے اس روّیے کو بیان کر کے جہاں اس کی خوداری کو بیان کیا ہے وہاں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جو اپنے کام اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں ان کو کوئی عہدہ دار ڈرا دھمکا نہیں سکتا۔ ایسے ہی خوددار اور جرات مند لوگ آخر کار اعلیٰ مقام پاتے ہیں۔ نور خان کے خاکے میں مولوی صاحب نے کرنل اسٹورٹ کا بھی ذکر کیا ہے جو خان صاحب کی جملہ خصوصیات کی بدولت ان کی بہت عزّت کرتا تھا۔ ایک تو نور خان کو خوشامد بالکل نہ آتی تھی اور دوسرا اس کا ذہن غلاموں جیسا نہیں تھا۔ کرنل اسٹورٹ اکثر نور خان سے کہا کرتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد انگریز افسران اس کو نقصان پہنچائیں گے مگر نور خان پر ان باتوں کا بالکل بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ نور خان بہت دیدہ دلیری سے انگریز افسران سے مخاطب ہوتا تھا۔ اس کے دل میں کبھی ان کا خوف یا ڈر نہ آیا۔ قاعدے قانون کو خوب جانتا اور پابندی کرتا بھی اور کرواتا بھی تھا۔ اس ضمن مولوی عبدالحق ایک اور واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگریٹ دان نکال کر سُلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگریٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداران کا رنگ فق ہو گیا۔"(۳۲)

مولوی عبدالحق نے نور خان کے خاکے میں اس کی جرات اور بہادری کے واقعات سے اس کی شخصیت کو سامنے لائے۔ نور خان کی شخصیت کے یہی منفرد پہلو ہی اس کو ایک دل چسپ اور قابلِ توجہ شخصیت بناتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے نور خان کی خاکہ نگاری میں واقعات کو ایک خاص تسلسل سے بیان کیا ہے۔ واقعات کی ترتیب کی بدولت موضوعِ خاکہ کے تمام پہلوؤں کو قاری کے سامنے لایا گیا ہے۔ نواب محسن الملک کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اُن کے سیاسی تدبّر اور انتظامی قابلیت کے واقعات کو خاص طور پر جگہ دی۔ وہ ریاست کے ملازم رہے اور اس ملازمت کے دوران جس دانش مندی سے انھوں نے اپنے فرائض انجام دیے مولوی عبدالحق نے اس کو سراہا ہے۔ نواب محسن الملک غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ریاستی معاملات میں اُتار چڑھاؤ سازشیں اور انتشار عام سی بات ہے لیکن نواب محسن الملک نے

کمال دانش مندی سے ان کا مقابلہ کیا۔ ریاستی سازشوں کا احوال نواب محسن الملک کے خاکے قدرے تفصیل سے ہے۔ فارن آفس اور گورنمنٹ اور ارکان ریاست ایک دوسرے کے خلاف ڈٹ جاتے تھے۔ حسد اور رقابت کی وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ اس صورت حال کو سنبھالنے کے نواب محسن الملک نے ہمیشہ اپنا کردار ادا کیا۔ مولوی عبدالحق ریاستی سازشوں کی صورتِ حال کو درست کرنے میں نواب محسن الملک کے کردار کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "پُر پیچ گتھّی کو اس طرح سُلجھانا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، رزیڈنٹ بہادر بھی خوش رہیں اور ریاست کے وقار کو بھی صدمہ نہ پہنچے اور اصل معاملہ (جو کچھ بھی نہ تھا) اس طرح طے ہو جائے کہ طرفین کو کچھ عُذر نہ ہو، ریاست کے انتظام میں سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا تھا۔ یہ کمال نواب محسن الملک کا خاص حصّہ تھا، ان کا ذہن ایسا رسا، ان کی طبعیت ایسی حاضر، ان کے اُوسان ایسے بجا اور معاملات و واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سُلجھا دیتے تھے۔ (۳۳)

یہاں اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد نواب صاحب کی معاملہ فہمی کو قاری کے سامنے لانا ہے۔ وہ ریاست کے ملازم ہونے کے باوجود سازشوں اور رقابتوں سے دور رہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو کبھی ریاست کے مقاصد سے بالا نہیں سمجھا۔ خاکے میں سازشی اور خوشامدی ٹولے کی کارستانیوں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ریاستی معاملات میں علمی قابلیت اور فضیلت کوئی معیار نہیں ہوتا۔ خوشامدی لوگ شاہ کے وفادار سمجھے جاتے ہیں اور یہی لوگ ریاست کے معاملات کو بگاڑتے ہیں۔ محسن الملک اور سر سیّد کی تحریک کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور جناب محسن الملک کی علی گڑھ تحریک کے لیے خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ تحریکِ علی گڑھ اور سر سّید خیالات و نظریات سے محسن الملک پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے اگر کوئی تحریک کا مخالف نظر آتا تو اس کی غلط فہمی کو دلائل کی بنا پر دور کرتے۔ بدرالدین سر سیّد کے مخالفین میں سے تھے۔ اُن کو رام کرنے کے واقعے کو مولوی عبدالحق اس خاکے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "بدرالدین طیب جی سر سیّد کے مشن اور علی گڑھ کالج کے مُخالف تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی سے ایسی فصیح اور پُر زور تقریر کی کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں ان کی دیرینہ مخالفت کو ہمدردی میں بدل دیا، اور

ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لیے ان سے وصول کر لیا۔ "[۳۴]

جناب محسن الملک نے تحریکِ علی گڑھ کے مقاصد کے حصول کے لیے جانفشانی سے کام کیا۔ جلسے جلوسوں میں ان کی تقاریر، خوش بیانی اور فصاحت و ظرافت کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم ان کی طرف کھینچا چلا آتا تھا۔ ہمیشہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ماتحتوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک مشہور تھا۔ مولانا حالی کی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے بھی مولوی عبدالحق نے واقعات سے مدد لی ہے۔ مولونا حالی سادگی اور دردِ دلی میں اپنی مثال آپ تھے۔ خاکساری اور فروتنی ان میں رچی بسی تھی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے سے محبت و مروّت سے پیش آتے۔ مولانا حالی کی اس خوبی کو مولوی عبدالحق نے ایک واقعہ سے اُجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر انوار مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اُٹھایا اور جھانک کر دیکھا۔۔۔ اس کے بعد کھانا منگوایا۔۔۔ پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر اکرا دیا ۔۔۔ مولوی انوار کہتے ہیں کہ رات بارہ ایک بجے انھیں محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رضائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا میں ہوں، آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا تھا۔ انوار صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ "[۳۵]

مولانا حالی کسی سے رقابت نہ رکھتے تھے۔ آپ نے مولانا آزاد اور شبلی کی کتابوں پر بہت اچھے تبصرے کیے۔ آپ کی سوچ ہمیشہ مثبت رہی اس کے باوجود آپ کے رقیبوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ آپ سے حسد کرنے والے آپ پر بے جا تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے لیکن آپ اپنے اوپر تنقید کرنے والوں سے بھی ہمیشہ نظر انداز کرتے یا پھر پیار سے سمجھا دیتے تھے۔ مولوی عبدالحق اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"قیامِ حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خان مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں دی "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خان سے ایسے شفقت آمیز

پیرائے میں نصیت کرنی شروع کی کی ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا اور ہنسی اُڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔"(۳۶)

نام دیو مالی جو مقبرہ رابعہ دورانی کا ایک مالی تھا، کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے مولوی عبد الحق نے اس کی شخصیت کو واقعات کی مدد سے بیان کیا۔ اس کی ذاتی خوبیوں کے بہت سے واقعات کو اس خاکے کا حصّہ بنا کر مولوی صاحب نے اُس کی تصویر بنائی۔ مولوی عبد الحق جب اورنگ آباد میں مقیم ہوئے تو ان کو مقبرہ دورانی کے اس مالی کی قربت کا موقع ملا ۔ اس کی کام سے محبت و لگن کے واقعے کو مولوی عبد الحق یوں بیان کرتے ہیں:

"نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اُس کا تھانولا صاف کر رہا ہے ۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کر دیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مُڑ کر دیکھا پھر اُلٹے پانو پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی اور خوشی بھی۔ کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔"(۳۷)

مولوی عبد الحق نے نام دیو کی کام سے سچی لگن اور دل چسپی کو بیان کر کے اس کی ذات کے روشن پہلوؤں قاری کے سامنے رکھا ہے۔ آپ نے وضاحت کی ہے کہ خوبیاں یا اچھائیاں کسی کی میراث نہیں ہوتیں جو کوئی بھی ان کو اپنا لیتا ہے وہ امر ہو جاتا ہے ۔ نام دیو کو سستی اور کاہلی بالکل پسند نہ تھی اور نہ ہی وہ کام کے اوقات میں آرام طلبی کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا۔ وہ دنیا و مافیا سے بے خبر اپنے کام میں مگن رہتا۔ ایک سال جب بارشیں کم ہوئیں اور پانی کی شدید کمی واقع ہوئی تو نام دیو کی روز مرّہ کی سرگرمیوں میں کیا تبدیلی آئی ملاحظہ کیجیے:

"ایک سال بارش کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی ۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اُٹھا کر لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔

مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلّت اور بڑھی تو اُس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کر لانا شروع کر دیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔"۔(۳۸)

مولوی عبد الحق نے واقعات سے نام دیو کی شخصی خوبیوں کو اُبھارتے ہوئے معاشرے کو یہ پیغام دیا کہ ہر حال میں اپنے کام کو انجام دینا چاہیے۔ حالات کیسے ہی مشکل کیوں نہ ہو انسان کا عزم اور حوصلہ اُس کو ہمیشہ فاتح بنا کر سامنے لاتا ہے۔ نام دیو نے آزمائش کے دنوں میں جس محنت و جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دیے اس کی بدولت ہی اس کا نام آج تک زندہ ہے۔ مولوی عبد الحق نے خاکہ نگاری کرتے ہوئے اہم واقعات کو شامل کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی احتیاط قابلِ تعریف ہے۔ ظاہر ہے کی کسی بھی شخصیت کے بیان کے لیے اُن کے پاس واقعات کی ایک لمبی فہرست ہو گی لیکن آپ نے کمال خوب صورتی سے صرف اُن ہی واقعات کو شخصیت نگاری کا حصّہ بنایا جو موضوعِ خاکہ کے بیان کرنے کے لیے اہم تھے۔ واقعات کے بیان میں کرتے ہوئے اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ ان کی قاری کے لیے کیا اہمیت ہے اور سماجی اور اخلاقی حوالے سے معاشرے پر اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ مولوی عبد الحق نے بطور ایک خاکہ نگار ہر اُس واقعے کو خاکے کا حصّہ بنایا جو سماجی اور اخلاقی حوالے سے مثبت اثرات کا حامل تھا اور ہر اُس واقعے سے پہلو تہی کی جس کے منفی اثرات ہو سکتے تھے۔ مولوی عبد الحق خاکہ نگاری کرتے ہوئے خاکے کے فنی لوازم کو بھرپور انداز سے پیشِ نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خاکے ہر عہد میں مقبول رہے۔

ب۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فنی جائزہ

شاہد احمد دہلوی نے خاکہ نگاری میں اس کے تمام فنی لوازم (اختصار، سراپا نگاری، اُسلوب، واقعات نگاری) کو پیشِ نظر رکھا۔ ایک خاکہ نگار جب کوئی شخصی خاکہ لکھتا ہے تو اس کے لیے سامنے مذکورہ شخصیت کے جملہ اوصاف ہوتے ہیں جن کو بیان کر کے وہ خاکہ کو قارئین کے لیے دل چسپ بناتا ہے۔ دل چسپی کے عنصر کے ساتھ ایک خاکہ نگار اختصار کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اختصار اور جامعیت کی خوبی خاکہ نگار کی فنی مہارت کو ظاہر کرتی ہے۔ اختصار کے بغیر خاکہ، خاکہ کی بجائے سیرت نگاری بن جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں اختصار اور جامعیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اختصار اور جامعیت کے بعد خاکہ نگاری کا ایک اور اہم عنصر 'سراپا نگاری' ہے اور سراپا نگاری میں شاہد احمد دہلوی دوسرے تمام خاکہ نگاروں سے ذرا آگے نظر آتے

ہیں۔ آپ کی خاکہ نگاری میں سراپا نگاری کی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی سراپا نگاری کے اتنے ماہر ہے کہ شخصیت کا سراپا بیان کرتے ہوئے قاری کے ذہن میں موضوعِ خاکہ کی ایک مکمل تصویر بیٹھا دیتے ہیں اور قاری خاکہ پڑھتے ہوئے صاحبِ خاکہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی شخصیات کا حلیہ، سیرت وعادات، خوبیوں اور خامیوں کو ایک ماہر قلم کار کی طرح پیش کرتے ہیں۔

واقعات نگاری کے حوالے سے اگر شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو پرکھا جائے تو اُن کے حُسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ ایک خاکہ نگار کے سامنے شخصیت کے متعلق کئی واقعات ہوتے ہیں۔ ان واقعات میں سے صرف ان واقعات کو چُننا جو شخصیت کے اظہار کے لیے از حد ضروری ہوں یقیناً جان جوکھوں کا کام ہے۔ آپ نے صرف ان ہی واقعات کو خاکہ نگاری میں جگہ دی جو صاحبِ خاکہ کو نمایاں کرنے کے لیے ضروری تھے۔ واقعات کے انتخاب کے بعد آپ نے ان کو ایک دلکش توازن سے بیان کیا ہے۔ قاری ان واقعات کی مدد سے موضوعِ خاکہ کی شخصیت سے آگاہ ہوتا ہے اور لُطف پاتا ہے۔ اُسلوب کے معاملے میں بھی شاہد احمد دہلوی دیگر خاکہ نگاروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ اُسلوبِ بیان کسی بھی ادیب یا نثر نگار کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ عبدالقیوم اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: "ایک کامیاب نثر نگار کی علامت یہ ہے کہ وہ۔۔۔ پڑھنے والوں کے دل میں ایک واضح اور روشن تصویر اُتار دے۔ (۳۹)

مشکل اور نامانوس الفاظ شخصیت کو دُھندلا کر دیتے ہیں۔ ایک خاکہ نگار لوگوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کم الفاظ میں شخصیت کو بیان کرتا ہے۔ اسلوب کی دلکشی قاری کو موضوعِ خاکہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی زبان ٹکسالی سادہ اور شستہ ہے۔ محاورات شگفتہ اور فقرات بے تکلفی اور برجستگی کا وصف لیے ہوئے ہیں۔ استعارات، تشبیہات، ضرب المثال کو ایک خاص انداز سے برتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو پڑھتے ہوئے دل و دماغ فرحت اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ فنی اعتبار سے شاہد احمد نے خاکہ لکھنے کے تمام لوازم کو پورا کرتے ہیں اور یہی چیز ان کو ایک کامیاب خاکہ نگار بناتی ہے۔ ان کے خاکوں میں فنی لوازم کے خاص توازن اور تناسب سے ملتے ہیں۔ یہاں ہم شاہد دہلوی کی کتاب "گنجینہ گوہر" کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا فنی عناصر جائزہ لیں گے۔ شاہد احمد دہلوی نے بحیثیت خاکہ نگار گنجینہ گوہر میں جتنے خاکے لکھے ہیں ان میں اختصار، سراپا نگاری، واقعات نگاری اور اسلوب کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہاں سب سے پہلے ہم شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں اختصار کی خصوصیت کا جائزہ لیں گے۔

اختصار

خاکہ نگاری کا اہم وصف کم سے کم جگہ کے اور عبارت میں پوری اور صحیح بات کرنا ہے۔ اس کو ہی اختصار کہا جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے خاکہ نگاری میں اختصار کی بنیادی فنی ضرورت کو ملحوظ رکھا ہے کیونکہ غیر ضروری طوالت قاری کو اصل مقصد سے ہٹا دیتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان کے بیان میں اختصار کے پہلو کو مدِ نظر رکھا ہے حالانکہ یہ نہیں تھا کہ ان کے پاس مواد کم تھا وہ مختصر مگر جامع انداز میں شخصیت کے تمام پہلوؤں کو قاری کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کے خاکے میں شاہد احمد نے ان کے ترجمہ نگاری کے فن کو دو تین لائنوں میں بیان کر کے ایک مکمل تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> " مولوی نذیر احمد نے دلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ پہلے تو ایک زبان کے الفاظ و خیالات کو کسی دوسری زبان میں پوری صحت کے ساتھ منتقل کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ پھر کلام اللہ کا ترجمہ کہ لفظ اِدھر سے اُدھر ہوا اور مفہوم بدلا۔ خدا جانے کن احتیاطوں اور دشواریوں سے یہ ترجمہ مکمل ہوا ہو گا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی معمولی مضمون کا ترجمہ بھی کرنے بیٹھتے ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔۔۔ ٹرانسپورٹیشن فار لائف "کا ترجمہ انہوں نے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کیا۔ ہم تو "عمر قید کرتے " مگر اس میں کالے پانی بھیجے جانے کا مفہوم ادا نہ ہوتا۔ "(۴۰)

نذیر احمد کے ترجمے کے کام اور ان کے بطور مترجم خصوصیات کو شاہد احمد دہلوی نے بہت خوبصورتی اور اختصار سے بیان کیا اور اُن کی حیثیت و خصوصیت کا تعین کیا ۔ اب اگر قاری مزید ان کے بارے میں مزید جاننا چاہتا ہے اور اُن کے تراجم سے مستفید ہونا چاہتا ہے تو ان کے تراجم کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے شاہد احمد دہلوی نے مختصر نویسی کے فن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ موضوعِ خاکہ کو کھول کے قاری کے سامنے رکھ دینا اور اختصار کے پہلو کو ہاتھ سے جانے نہ دینا کوئی سیکھے تو آپ سے۔ ایک کامیاب خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مختصر بیان سے قاری کو صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے ہر پہلو سے روشناس کرا دے۔ خواجہ غلام حسن نظامی کے خاکے میں بھی شاہد احمد دہلوی نے اختصار کے فن کو خوب نبھایا ہے۔ خواجہ حسن کے خاکے میں ان کی علمی، ادبی مصروفیات اور معرکوں کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی شخصیت کے ایک اور اہم پہلو حکمت کو بھی آشکار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "دلی میں جتنے دی مسلمان ایڈیٹر اور اشتہاری حکیم تھے سب کے سب بالواسطہ

یابلاواسطہ خواجہ صاحب کے مرہون منت تھے۔ خواجہ صاحب نے کتابوں اور رسالوں کے علاوہ دوائیں اور غذائیں بھی بیچنی شروع کر دی تھیں۔ "فقیر کی چٹکی" اور "چودہ چھوہارے" اور عجیب عجیب ناموں کی دوائیں تھیں۔ دوائیں ان کی کتابوں سے بھی زیادہ بکتی تھیں۔ سویابین اور فاسفورس کا تیل تو پاکستان بننے سے پہلے تک مشتہر ہوتا رہا۔"(۴۱)

یہاں پر شاہد احمد نے خواجہ حسن نظامی کی علمی و سماجی خدمات کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے۔ جہاں وہ علم کی ترویج و ترقی کے لیے کتابوں اور رسالوں کے کاروبار کی بات کرتے ہیں وہاں ان کی حکمت، دواؤں اور غذاؤں کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ ان کے مشہور حکیمی نسخوں کے نام بھی بتائے گئے ہے۔ اگر شاہد احمد دہلوی خواجہ حسن نظامی کی سماجی اور علمی خدمات کا علیٰحدہ علیٰحدہ ذکر کرتے ہوا تو خاکہ غیر ضروری طوالت کا شکار ہو جاتا۔ آپ نے نہایت خوبصورتی سے دونوں کو ایک جگہ بیان کر کے اختصار کے فن کو بخوبی نبھایا۔ شاہد احمد نے مولوی بشیر احمد الدین کے خاکے میں اپنے والد کے بچپن کے ایّام کا احوال بیان کیا ہے۔ دادا کو پیش مسائل کا ذکر بھی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے مطابق اُن کے ابّا نے جب آنکھ کھولی تو گھر میں خوشحالی تھی۔ آپ نے مولوی بشیر الدین احمد کے خاکے میں اپنے دادا کی علمی کاوشوں کا مختصر حال بیان کر کے ان کی علم دوستی کو اُجاگر کیا۔ مولوی بشیر الدین احمد کے خاکے میں ایک انگریز ڈائریکٹر کا ذکر ہے جس کے اُن کے دادا سے علمی و ادبی مراسم تھے اور اُس نے مولوی نذیر کے علمی و ادبی کام کو آگے بڑھانے اُن کی خاطر خواہ مدد کی۔ اس کا مختصر احوال بیان کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں۔

"صاحب نے اِسے بھی جستہ جستہ دیکھا" اور حیران ہو کر بولے "مولوی صاحب آپ نے ایسی اچھی اچھی کتابیں لکھ کر گھر میں رکھ چھوڑی ہیں، انہیں فوراً چھپوا دیجئے تاکہ سب بچے ان سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ یہ کتابیں دادا ابّا نے چھپوادیں ایک مراۃالعروس تھی اور دوسری مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ چندپند تھی یا منتخب الحکایات ۔ان دونوں کتابوں پر صاحب نے سفارش کر کے سرکار سے انعام دلوادیا۔ اس سے دادابّا کو احساس ہوا کہ اچھی کتابیں لکھنے کی ان میں صلاحیت ہے۔ چنانچہ بچیوں کے لیے مراۃالعروس کا دوسرا حصہ بنات النعش لکھا اور لڑکوں کے لئے فارسی کی آسان گرامر "صرفِ صغیر" اور عربی کی گرامر "مایغنیک فی الصرف" لکھی۔۔۔۔ توبتہ النصوع ، ابن الوقت، فسانہ مُبتلا اور ایّامٰی اسی دور کی یادگار ہیں۔(۴۲)

مولوی بشیر الدین احمد کے خاکے میں مولوی نذیر احمد نے اپنے دادا کے علمی و ادبی خدمات کا مختصر خلاصہ بیان کیا ہے اسی خاکہ میں شاہد احمد دہلوی نے مولوی بشیر الدین احمد کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں ان کے والد کا احوال بھی بیان کیا ہے شاہد احمد دہلوی میں نے دونوں شخصیات کو کمال خوبصورتی سے جوڑا ہے شاہد احمد دہلوی نے بشیر الدین احمد دہلوی کی ابتدائی تعلیم ان کی والدہ ان کی سرگرمیوں، عادات و خصائل، مذہبی رجحان ان کی علم اور ادب کے حوالے سے خدمات کو انتہائی اختصار سے ان کے خاکے میں بیان کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنی خاکہ نگاری میں شخصیات کے بیان میں ان کی زندگی کے ایسے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کی ذات سے جوڑے تھے۔ ایک خاکہ نگار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ممدوح کی تمام خوبیوں ،خرابیوں، معمولات و خدمات کو بیان کر دے اور اس بیان میں وہ اختصار کے پہلو کو ضرور مدِ نظر رکھے۔ ورنہ خاکہ طویل ہو جائے گا اور قاری کی دل چسپی کم ہو جائے گی۔ مولانا عنایت اللہ کی خاکہ نگاری میں بھی شاہد احمد نے ان کی ترجمہ میں غیر معمولی صلاحیت کو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آپ کے ترجمہ میں روانی اور بے ساختگی کی خوبی آپ کو دوسرے ترجمہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی آپ کی اس خصوصیت کو سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "مولانا عنایت اللہ دہلوی ترجمہ کرنے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں تو ان کے والد شمس العماء ذکاءاللہ دہلوی بھی اپنے وقت کے مشہور ترجمہ نگار تھے اور انہوں نے بھی بہت سے تراجم کیے مگر ان کے ترجموں میں وہ روانی بے ساختگی نہیں ہے جو مولانا کے تراجم میں پائی جاتی ہے۔"(۴۳)

درج بالا اقتباس میں شاہد دہلوی نے مولانا عنایت اللہ کے فنِ ترجمہ نگاری کی مہارت کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ پہلے ان کی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے پھر آگے چل کر اُن کی ترجمہ میں روانی اور بے ساختگی کو بیان کر کے اُن کے تراجم کو اُن کے والد سے بھی اعلا میعار کا حامل قرار دیا ہے۔ یوں شاہد احمد دہلوی نے چند سطروں میں مولانا عنایت اللہ کی فنِ ترجمہ نگاری میں مقام کا تعین کر دیا ہے۔ ان چند سطروں کو پڑھ لینے کے بعد قاری مولانا کی فنِ ترجمہ نگاری میں یکتا ہونے کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مولانا عنایت اللہ کے خاکے میں شاہد احمد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سر سیّد بھی اُن فنِ ترجمہ نگاری سے بہت متاثر تھے۔ سر سیّد نے مولانا عنایت اللہ سے آرنلڈ کی کتاب "پریچنگز آف اسلام" کا ترجمہ بھی کرایا اور جب آپ یہ ترجمہ کر چکے تو مولانا عنایت اللہ کے والد کو خط لکھا اور مزاحاً کہا "تم اپنے لڑکے سے ترجمہ کرنا سیکھو"

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خاکے میں بھی شاہد احمد دہلوی نے ان کے خاندان، پیدائش، بچپن اور دوسری سرگرمیوں کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ایک دل چسپ سکیچ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بچپن اور ابتدائی تعلیم کا احوال ملاحظہ فرمائیں:

> "لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاوہ کے سکول میں۔ کالج کے ہی زمانے میں نواب مزّمل اللہ خاں کے ملازمت بھی کر لی تھی۔ کیونکہ شادی ہو گئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی بلکہ بچوں کی کہانی "قصرِ صحرا" کا پہلا حصّہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے دو حصّے بعد میں لکھے۔ محنتی اور ذہین تھے۔"(۴۴)

شاہد احمد دہلوی نے عظیم بیگ چغتائی کے بچپن، تعلیمی سرگرمیوں، ملازمت اور بطور مضمون نگار تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ آپ نے بیان کیے گئے تمام پہلوؤں کو مختصراً بیان کرتے ہوئے صاحبِ خاکہ کا ایک بھرپور عکس قاری کے دل و دماغ میں بٹھایا ہے۔ قاری ان معلومات کے حصول کے بعد چغتائی صاحب بہت کچھ جان لیتا ہے۔ ایک خاکہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اختصار سے چیزوں کو بیان کر کے قاری کے اندر مزید جاننے کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ میر اجی کی خاکہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی نے میر اجی کی شخصیت کو سرسری انداز میں پیش کیا ہے۔ شاہد احمد نے ان کی جوانی "ادبی دنیا" کے لیے ان کی خدمات، ان کی وضع قطع، رہن سہن کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ شاہد احمد میر آجی کی ریڈیو کے لیے خدمات مختصراً بیان کیا ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

> "ریڈیو کے لیے مسودات لکھنے میں میر آجی کو کافی مہارت ہو گئی تھی اور حسبِ ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ گیت ریڈیو میں ہی آ کر لکھے اور اتنے کہ ان کا مجموعہ "گیت ہی گیت" کے نام سے شائع ہوا۔ نثر میں بھی صاحبِ طرز تھے۔ اندازِ فکر فلسفیانہ اور طرزِ بیان انشاپردازانہ تھا۔ نظمیں جب کہنے پر آتے تھے تو کئی کئی کہہ لیتے تھے۔ مگر خدا جانے کب کہتے تھے اور کس کیفیت میں کہتے تھے۔ چند نظمیں خود ان سے سمجھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود ان کی سمجھ میں بھی نہ آئیں۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت ستھری۔"(۴۵)

شاہد احمد دہلوی نے میر آجی کی علمی مہارت کو ایجاز و اختصار سے بیان کیا ہے۔ ایک ہی پیراگراف میں

میرؔ آجی کے مسودات، گیتوں کے مجموعے کا ذکر بھی کیا ہے اوران کو صاحبِ طرز ادیب اور انشاپرداز کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے چند لائنوں میں میرؔ آجی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا بیان کر دیا ہے۔ حکیم کیفؔ دہلوی کا خاکہ سب سے مختصر ترین خاکہ ہے۔ اس خاکہ میں آپ نے حکیم کیفؔ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ شاہد احمد نے حکیم صاحب کے قد کاٹھ، چہرہ اور لباس کی خوب تصویر کشی کی ہے۔ آپ نے حکیم ہاشم جان کیفؔ کو اچھے طبیب کے ساتھ ایک شاعر کے طور بھی پیش کیا ہے۔ حکیم کیف کے خاکے میں ایک مشاعرہ کا ذکر ہے اس میں حکیم کیفؔ کے کلام کی مقبولیت کا تذکرہ بہت ہی مختصر انداز میں ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> "جب کیفؔ نے مطلع پڑھاتو مشاعرہ چمک اُٹھا۔ دلکش ترنم، پاٹ دار آواز، موزوں زیر وبم، عمدہ شعر، وہ جم کر پڑھا کہ لطف آ گیا۔ بار بار شعر مکرر پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھیاور کیفؔ کی آواز کی تونائی بڑھتی جاتی تھی۔ جب غزل ختم ہو گئی تو چاروں طرف سے ماشااللہ اور سبحان اللہ کی بارش ہو رہی تھی۔ کیفؔ نے مشاعرہ لُوٹ لیا۔ اس کے بعد کئی شاعروں نے پڑھا مگر کسی کا رنگ نہ جم سکا۔"(۴۶)

شاہد احمد دہلوی نے ان کے خاکے میں اُن کی حکمت و دانش کے دوسرے واقعات کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری سے محبت اور لگاؤ کو بھی بہت ہی مختصر پیش کیا ہے۔ قاری حکیم کیفؔ کو واقعی ہی ایک باکمال شاعر سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ خود شاہد احمد دہلوی کے مطابق ہی شاعری ان کے اُستاد کی ہوتی تھی اور حکیم کیفؔ صرف اس کو اپنی مترنم اور پاٹ دار آواز میں میں پڑھتے تھے۔ دراصل شاہد احمد دہلوی واقعات کو اختصار سے بیان کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ سب کچھ اس سلیقے اور تسلسل سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے لُطف میں کمی یا جھول نہیں آنے دیتے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید کے خاکے میں بھی آپ نے اُن کی خدمات اور عادات و خصائل کا ذکر کرنے کے ساتھ اُس وقت کی معاشرتی سوچ اور سر سیّد کے نظریے کو بھی انتہائی چابک دستی سے بیان کر دیا۔ آپ نے مختصر سے بیان میں قاری کو انگریزی زبان کی افادیت بھی سمجھا دی۔ آپ نے مرزا محمد سعید کی شخصیت کو بھی اُجاگر کر دیااور سر سیّد کی تعلیمی خدمات کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> "پچاس ساٹھ سال پہلے دلّی کے مسلمان شُرفاء میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر سر سیّد نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت حد تک

اصلاح کر دی تھی۔اُسی زمانے میں دلّی کے دو نوجوانوں نے اعلےٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ایک پروفیسر مشتاق احمد زاہدی تھےاور دوسرے مرزا محمد سعید۔مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے اُستادوں میں علامہ اقبال بھی تھے جن سے ان کے مخلصانہ تعلقات آخر دم تک رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۱۹۰۶ میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا۔"(۴۷)

شاہد دہلوی کے خاکوں میں اختصار کی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔انسانی زندگی کے عروج و زوال کو وہ مختصراً بیان کرتے ہوئے واقعات کی مدد سے شخصیت کا عکس سامنے لاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیت کی خاکہ نگاری کی ہے اُن کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو ایک ماہر فن کار کی طرح بیان کیا ہے اور ان کی پوری زندگی کو چند صفحات میں بیان کر دیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات کے خاکے لکھے اُن کی زندگی کے ایک پہلو کو بیان کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھی جاسکتی تھیں مگر شاہد احمد دہلوی نے ایک ماہر فنکار کی طرح صرف اور صرف منفرد پہلوؤں کو بیان کر کے موضوعِ خاکہ کو اُجاگر کیا۔ آپ نے حالات و واقعات کو سرسری انداز سے نہیں دیکھا بلکہ پسِ منظر کی روح تک پہنچے۔ آپ نے اختصار کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر معمولی واقعہ کو غیر معمولی انداز سے پیش کیا۔

سراپا نگاری

خاکہ نگاری میں شخصیت کے خط و خال کو اُبھارنے کے لیے موضوعِ خاکہ کے حلیہ، قد و قامت اور لباس کی تفصیلات کو قاری کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ یوں قاری صاحبِ خاکہ کا ایک تصور قائم کرتا ہے۔ اسے سراپا نگاری کہتے ہیں۔ سراپا نگاری کے لیے خاکہ نگار کے مشاہدہ کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مشاہدہ جس قدر تیز ہو گا اُس کی بنی ہوئی تصویر اسی قدر متحرک اور موثر ہو گی۔ ایک خاکہ نگار کسی بھی شخصیت کی صورت، سیرت، عادات و خصائل اور خوبیوں خامیوں کی تصویر بنا کر قاری کے سامنے رکھتا ہے اور پھر قاری اسی تصویر کے ذریعے اپنی محبوب شخصیت سے ملاقات کرتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کی دل کشی کی ایک بڑی وجہ ان کی سراپا نگاری ہے۔ شاہد احمد نے جن لوگوں کے خاکے تحریر کیے ان کے ساتھ آپ کے قریبی تعقات تھے۔ آپ نے ذاتی معلومات کی بنا پر اُن شخصیات کو سر تا پاؤں بیان کیا ہے۔ اگر خاکہ نگار ظاہری شکل و صورت پیش نہیں کرے گا تو شخصیت کا تعارف نہیں ہو سکے گا۔ سراپا نگاری ایک انتہائی مشکل کام ہے جس میں

خاکہ نگار ممدوح شخصیت کے حلیہ اوراعادات واطوار کا پہلے خود گہرائی سے مشاہدہ کرتا ہے اور پھر محتاط انداز سے ان کو قاری کے سامنے رکھتاہے۔اس ضمن میں خاکہ نگار کی معمولی سی کوتاہی قاری کو صاحبِ خاکہ سے متنفر کر سکتی ہے۔شاہد احمد چہرہ نویسی میں یدِ طولٰی رکھتے تھے۔آپ قاری کو موضوعِ خاکہ سے اس طرح ملواتے ہیں کہ قاری ان دیکھے شخص سے سے مانوس ہو جاتا ہے۔میر ناصر علی کے خاکے میں شاہد احمد ان کا سراپا کچھ اس طرح بیان کیاہے:

"سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔کش کش داڑھی،پہلے تل چاؤلی تھی،پھر سفید ہو گئی۔ کتری ہوئی لبیں۔پوپلا منہ۔دہانہ پھیلا ہوا۔بے قرار آنکھیں۔ماتھاکھُلا ہوابلکہ گُدّی تک ماتھاہی ماتھا چلا گیا تھا۔جوانی میں سرو قد تھے،بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔مستانہ وار جھوم کے چلتے تھے۔"(۴۸)

شاہد احمد نے میر ناصر علی کی شخصیت کو یوں بیان کیا کہ قاری ایک ہجوم میں بھی میر صاحب کو پہچان لے گا۔آپ نے الفاظ سے میر ناصر علی کی ایک متحرک تصویر بنائی اور اس سلسلے میں آپ جو الفاظ چُنے وہ بہت ہی سادہ اور آسان ہیں۔شاہد احمد نے سراپانگاری کے ذریعے موضوعِ خاکہ کی ایک منفرد اور جاندار تصویر پیش کرتے ہیں اور شخصیت کا ایک واضح تصور قائم کرتے ہیں۔شاہد احمد دہلوی کی اس خصوصیت کا ذکر یحٰیی امجد اس طرح کرتے ہیں:"شاہد صاحب کا فن بہت پختہ ہے اور وہ چہرہ نویسی سے لی کر نفسیاتی تجزیے تک،ہر وادی کے زیرک مسافر ہے۔"(۴۹)

سراپا نگاری میں شاہد احمد دہلوی کا مقابلہ ممکن نظر نہیں آتاشاہد احمد اپنی نگاہِ انتخاب سے موضوعِ خاکہ کے نقوش کو بیان کر کے اُس کی سیرت کو بیان کرتے ہیں۔آپ ایک ماہر نفسیات کی طرح شخصیت کے اندر تک جھانکتے ہیں اور پھر بہت ہی خوش کُن انداز میں شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔خواجہ حسن نظامی کو شاہد احمد قاری سے متعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آخر آخر میں اُن کی ڈاڑھی میں چند سفید بال البتہ آ گئے تھے ورنہ خود ان میں سرِ مو فرق نہ آیا تھا۔لمبا اُونچا قد،چھریرا بلکہ دُبلا بدن،سر پر کُلاہ نما پیلی ٹوپی۔لمبا سا چُغہ۔بڑے پائچوں کا پاجامہ۔پاؤں میں دیسی جُوتی،رنگ شہابی،چہرہ کتابی۔آنکھوں میں سنہرے فریم کی عینک۔جس میں آنکھیں ہیرے کی طرح جگر جگر چمکتی

تھیں۔ سُواسی ناک۔ موزوں دہانہ، لب ذرا موٹے۔ کترواں لبیں۔ مُٹھی بھر پھریری ڈاڑھی۔ صراحی دار گردن۔ شانوں پر کاکلیں کالے ناگوں کی طرح لہراتی اور افعی کی طرح بل کھاتی۔ چلتے تو کڑی کمان کے تیر کی طرح۔ بیٹھتے تا لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔"(۵۰)

اس اقتباس میں شاہد احمد نے کم سے کم الفاظ کے استعمال سے خواجہ حسن نظامی کی تصویر بنائی ہے۔ قاری ان الفاظ کی مدد سے خواجہ صاحب کا ایک خیالی عکس اپنے ذہن میں بنالیتا ہے۔ شاہد احمد چہرے کے خط وخال کے ساتھ صاحبِ خاکہ کو بھی بیان کرتے ہیں لیکن اُن کا یہ بیان ایسا دل کش ہوتا ہے کہ قاری موضوعِ خاکہ کی خامیوں کو جان کر بھی اُس کی ذات سے متنفر نہیں ہوتا۔ شاہد احمد نے خواجہ حسن نظامی کے کے جذبات کو بھی ان کے خاکے میں جگہ دی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح دُشمنی میں وہ آخری حد تک جاتے ہیں اور کس قدر جلد اُن کو منایا بھی جاسکتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"خواجہ صاحب ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہو جاتے تھے۔ قائد اعظم سے اختلاف ہوا تو عرصہ دراز تک اُن کے خلاف لکھتے رہے۔ پھر اُن کے ہم خیال ہوئے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رُو سے مولانا آزاد کے قتل کا فتوٰی دے دیا۔ اس کے بعد مولانا آزاد کے بھی دوست ہو گئے۔ علامہ اقبال سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ نہ جانے خواجہ صاحب کو کس بات سے رنجش ہو گئی کہ اقبال کو شاعر مشرق سے گھٹا کر انہوں نے شاعر پنجاب لکھنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال نے سوچا یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ صاحب کو زک دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں مدت سے درد تھا۔ میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا۔ اس سے درد کو افاقہ ہو گیا۔ اُس دن سے علامہ اقبال پھر شاعر مشرق ہو گئے۔ منادی میں فاسفورس کا جو اشتہار چھپتا تھا اُس میں علامہ محمد اقبال کی رائے ضرور شائع کی جاتی تھی۔"(۵۱)

شاہد احمد نے خاکہ نگاری کرتے ہوئے عادات وخصائل کو خاص اہمیت دی ہے۔ دراصل شخصیت کی علمی ادبی خدمات کو بیان کر دینے سے موضوعِ خاکہ کی فکر اور سوچ تو قارئین کو ضرور پتا چل جاتی ہے لیکن ایک خاکہ نگار جب لوگوں سے تعلقات اور رکھ رکھاؤ کو کو پر بات کرتا ہے تو اس سے صاحبِ خاکہ کے

معاشرتی روّیوں کا پتا چلتا ہے۔ معاشرتی روّیے کسی بھی شخصیت کا اُجاگر کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ شاہد احمد نے اُستاد بے خود دہلوی کی عادات واطوار کے ذکر میں اُن کی گپ بازی کی عادت کو شگفتہ انداز سے دیکھا ہے۔ شاہد احمد کے نزدیک اُستاد بے خودؔ کی گپ بازی مرعوب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اُن کا مقصد لوگوں کو ہنسنا ہنسانا تھا۔ اُستاد بے خود اپنے آپ کو ایک ماہر شکاری گردانتے تھے۔ آپ کے گوالیار کے حاکم سے خصوصی تعلقات تھے۔ جب اُستاد بے خود شکار کے سلسلے میں گوالیار جاتے تو میزبانوں کو اس کی اطلاع کیسے ہوتی۔ اس ضمن میں اُستاد بے خود کی گپ ملاحظہ فرمائیں:

> "اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کونجوں کی ایک قطار اُڑتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے امین الدین سے کہا کہ جلدی سے بندوق نکال کر دینا۔ انہوں نے بکس کھول کر بندوق نکالی۔ اور میں کارتوس لگا کر اس طرح فیر کیا کہ ایک کونج تو میرے ہی قدموں میں آ پڑی۔ دوسری ان صاحب کے گھر میں گری جن کے ہاں مجھے مہمان ہونا تھا اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری۔ میرے میزبان سمجھ گئے کہ یہ کونج بیخودؔ صاحب نے گرائی ہے۔"(۵۲)

شاہد احمد سراپا نگاری کے فن کو استعمال کرتے ہوئے خاکہ کو بہت زیادہ پُر لطف اور حقیقی بنا دیتے ہیں۔ سراپا بیان کرتے ہوئے شاہد احمد کا ایک ایک لفظ معنی خیز ہوتا ہے۔ جگرؔ مراد آبادی کا سراپا بیان کرتے ہوئے جو الفاظ آپ نے چُنے اُن کی بدولت جگرؔ مراد آبادی مجسم صورت لیے قاری کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ جگرؔ صاحب کا سراپا بیان کرتے ہوئے شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

> "کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ سر میں اُلجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرے کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور مُنہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری کے باعث مُنہ اُگلدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی ڈاڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، بر میں اچکن، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں، پاؤں میں پٹینٹ کی گُرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد کا اٹاچی کیس۔"(۵۳)

شاہد دہلوی نے جگر مراد آبادی کو سر تا پاؤں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کے دل و دماغ میں ایک مکمل نقش بیٹھ جاتا ہے۔ سراپا نگاری کی بدولت خاکہ پڑھتے ہوئے قاری لذّت محسوس کرتا ہے کیونکہ ایک

زندہ جاوید تصویر اس کے ذہن میں منقش ہوتی ہے۔ حلیہ نگاری میں جو کمال شاہد احمد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے خاکہ نگار کے حصّہ میں نہیں آیا۔ شاہد احمد نے سراپا نگاری کے فن کو مختلف انداز میں برتا ہے۔ کبھی وہ خاکہ کے شروع میں سراپا بیان کرتے ہیں اور کبھی خاکہ کے درمیان میں ۔ ایم۔اسلم کے سراپا کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سرو قد۔ کُھلتا رنگ، کتابی چہرہ، خندہ پیشانی، چمک دار آنکھیں، ان پر عینک، پتلے پتلے لبوں پر کترواں مونچھیں جن میں ایک غمگین مسکراہٹ چھپی رہتی ہے، ٹھوڑی سے سے استقلال ٹپکتا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی ، کوٹ اور شلوار، کالر اور ٹائی۔ عمر ستّر سے متجاوز، کاٹھی مضبوط۔ یہ ہے ایم اسلم کی ظاہری وضع۔ جیسا ان کا ظاہر اُجلا ہے ویسا ہی ان کا باطن بھی سُتھرا ہے۔ باتیں بڑی موثّر اور دلکش کرتے ہیں۔ اُن کے اندازِ گفتگو سے اُن کی شرافتِ نسبی ٹپکتی ہے۔"(۵۴)

شاہد احمد ایم اسلم کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے اُن کی شکل وصورت کا ایک عکس بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں شاہد احمد کی بحیثیت خاکہ نگار ایک خوبی سامنے آتی ہے کہ وہ موضوعِ خاکہ کے حلیہ کے ساتھ جب اُس کے شخصی اوصاف قاری کو سُناتے ہیں تو صاحبِ خاکہ کے لیے عزت واحترام کے جذبات بھی پروان چڑھتے ہیں۔ قاری صاحبِ خاکہ سے سے مرعوب ہوتا ہے اور موضوعِ خاکہ کی ذات وصفات کے متعلق مزید جاننے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ شاہد احمد نے سراپا نگاری میں اختصار کو بھی ملحوظ رکھا ہے کیونکہ سراپا نگاری دراصل کسی شخصیت کے حلیے اور اوصاف کا بیان ہی ہے یہ بیان اگر ضرورت سے زیادہ طویل ہو گا تو خاکہ کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ شاہد احمد نے جن لوگوں کے خاکے تحریر کیے ہیں اُن سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا بیان کیا گیا سراپا فرضی یا خیالی نہیں ہے۔ آپ نے سراپا نگاری نہیں بلکہ حقیقت نگاری کی ہے اور آپ کی بیان کردہ شخصیات آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھار شاہد احمد دہلوی سراپا کو بیان کرتے کرتے ہلکی پھلکی مزاح کا تاثر بھی پیدا کرتے نظر آتی ہیں ۔ عظیم بیگ چغتائی کے سراپا میں مزاح کی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

"پھر خوب ہنسے تو میں دیکھا کہ نیچے کے چار دانت غائب ۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھّریاں ۔ کلّے پچکے ہوئے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف قوسیں۔ لبوں پر لاکھا سا جما ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی صاف۔، دُبلا پتلا سا

شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے مجھے جھانک رہا ہے۔ میں نے کہا مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کل رات اپ کو تانگے میں جاتے دیکھا مگر ہم نے آپ کو نہ پہچانا۔"(۵۵)

شاہد احمد دہلوی الفاظ کی مدد سے شخصیات کو متحرک کر کے قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ قاری الفاظ کی بدولت ایک چلتے پھرتے اور جاندار کردار سے سے ملاقات کرتا ہے۔ شاہد احمد نے اُن کے چہرے کے خط وخال کو الفاظ میں یوں بیان کیا کہ چغتائی صاحب کا ایک جامع اور متحرک پیکر سامنے آیا۔ جس طرح ایک sketch میں کسی شخصیت کے خط و خال لکیروں کی مدد سے اُبھار کر ایک تصویر مکمل کی جاتی ہے بالکل اسی طرح شاہد احمد دہلوی الفاظ کی مدد سے صاحبِ خاکہ کے چہرے کو اُبھار کر سامنے لاتے ہیں۔ ایک خاکہ نگار زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ اُسے کم سے کم الفاظ میں شخصیت کا عکس پیش کرنا ہوتا ہے۔ شاہد احمد نے سراپا نگاری اختصار اور جامعیت کے اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی سراپا نگاری کرتے ہوئے شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

"ایک بڑے رشمین سے نوجوان سامنے آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ اُنہوں نے سلام کیا۔ میں نے اُنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، یاسمینی رنگ، کُشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، کتراسی ناک، پتلے پتلے گُلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخدان، ڈاڑھی مونچھ صاف، سفید سِلک کی شیروانی، اکبِرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید سانبھر کی جوتی۔"(۵۶)

درج بالا اقتباس میں شاہد احمد دہلوی نے جمیل جالبی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ پہلی نظر میں شاہد احمد نے جمیل جالبی کو جیسا دیکھا، بیان کر دیا۔ شاہد احمد کی سراپا نگاری اتنی متاثر کُن ہوتی ہے کہ قاری شخصیت کے سحر سے باہر نکل ہی نہیں پاتا اور یہ ایک خاکہ نگار کی بہت بڑی کامیابی ہوتی کہ وہ قاری کو صاحبِ خاکہ کی طرف لے آئے۔ شاہد احمد دہلوی اس فن کے بہت ماہر نظر آتے ہیں۔ آپ نے سراپا نگاری کے عنصر کا اس خوب صورتی سے برتا کہ قاری آپ کے خاکوں میں اس عنصر کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ آپ نے جن لوگوں کے سراپے کو بیان کیا ہے قاری ان کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ آپ کی ایک اور خوبی حلیے اور شخصی اوصاف کا ایک ساتھ بیان ہے دونوں کے حسین امتزاج سے آپ خاکے میں لطف پیدا کرتے ہیں۔ آپ کی سراپا نگاری اور شخصی اوصاف کے بیان کی بدولت جب بھی موضوعِ خاکہ کا ذکر یا اُس کی کو

ئی تخلیق قاری سامنے سے گزرتی ہے تو گویا وہ شخصیت قاری کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ماہرینِ خاکہ نگاری، سراپا نگاری کو فنِ خاکہ نگاری کا ایک جُز مانتے ہیں جس سے کسی شخصیت کو اُبھارا جا سکتا ہے۔اُن کے مطابق اگر سراپا بیان نہ بھی کیا جائے تو خاکہ لکھا جا سکتا ہے۔اُن کا نقطہ نظر بھی درست ہے مگر شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں سراپا نگاری سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر سراپا کو بیان کیا جائے تو خاکہ کی عمارت مضبوط بنیادوں پر اُستوار ہو گی۔

اُسلوب

اُسلوب کسی بھی ادیب یا شاعر کی پہچان ہوتا ہے۔اُسلوب یا طرزِ نگارش پر کوئی حتمی یا دوٹوک بات نہیں کی جا سکتی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ افکار و خیالات پیش کرنے کا دل نشین اور منفرد انداز اُسلوب یا پھر طرزِ نگارش کہلاتا ہے۔شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب میں شگفتگی اور شائستگی کا عنصر نمایاں ہے اور اسی عنصر نے اُن کے خاکوں کو زیادہ جاندار بنایا ہے۔ کسی بھی تحریر کی طرح خاکے میں دل چسپی کا انحصار اُس کے اُسلوب نگارش پر ہوتا ہے۔ خاکے میں چونکہ صرف اور صرف سچائی کا بیان ہوتا ہے اور سچ تھوڑا کڑوا ہوتا ہے اس لیے ایک خاکہ نگار اُسلوب کی دلکشی سے سچائی کو قابلِ قبول بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ایک خاکہ نگار چونکہ اَن دیکھی شخصیات کو سامنے لاتا ہے اس کے لیے خاکہ نگار کو اُسلوب کی بے تکلفی اور لطافت کی ضرورت پڑتی ہے ۔اس طرح ہی قاری اور موضوعِ خاکہ کے درمیان دوستانہ تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔اگر خاکہ نگاری میں اُسلوب کی اہمیت کو دیکھا جائے تو وہی خاکہ نگار کامیاب نظر آتے ہیں جو شخصیت کے اچھے بُرے پہلوؤں کو بیان کرنے میں کسی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے اور خصوصاً خامیوں کو اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ موضوعِ خاکہ سے دُوری پیدا نہیں ہوتی بلکہ خامیاں کسی قدر دلکش لگنے لگتی ہیں۔ خاکہ نگار کا اُسلوب جس قدر بے تکلف اور قدرتی ہو گا اُس کو اتنی ہی دل چسپی سے پڑھا جائے گا۔ خاکہ نگار ایک تماشائی ہے۔وہ جو کچھ دیکھتا ،مشاہدہ یا پھر محسوس کرتا ہے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔اس کا مقصد صاحبِ خاکہ کی جیتی جاگتی تصویر کو سامنے لانا ہوتا ہے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "بعض لوگ خاکہ لکھتے ہوئے موضوع کی بجائے اپنی ہی ذات کو نمایاں کرنے لگتے ہیں اور اس مقصد کے لیے واحد متکلم کا جا و بے جا استعمال کرتے ہیں ۔خاکہ ذاتی واقفیت پر مبنی مواد کے سہارے لکھا جاتا ہے اس لیے ضمیر واحد متکلم سے کامل اجتناب ناممکن ہے لیکن اس کا استعمال کم از کم اور پوری احتیاط سے ہونا چاہیے تاکہ

خاکہ موضوعِ شخصیت کے ساتھ خاکہ نگار کے تعلقات کا اشتہار اور موضوعِ خاکہ
کے بجائے خاکہ نگار کی تصویر نہ بن جائے۔"(۵۷)

کسی بھی ادیب یا خاکہ نگار کا اُسلوب ہی اس کی تحریر کو ادبی شاہکار بناتا ہے۔ اگر اُسلوب عمدہ نہیں ہو گا تو دوسری تمام خصوصیات بے معنی ہو جائیں گی۔ موثر اور دل چسپ اُسلوب خاکہ نگار یا نثر نگار کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبد القیوم اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:"ایک کامیاب نثر نگار کی علامت یہ ہے کہ وہ۔۔۔پڑھنے والوں کے دل میں ایک واضح اور روشن تصور اُتار دے۔"(۵۸)

منہ سے ادا ہونے والے الفاظ دراصل قاری کے ذہن میں پیوست ہو کر ایک مربوط تصویر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر خاکہ نگار مشکل الفاظ اختیا کرے گا تو تصویر دھندلی ہونے کا خدشہ ہو گا۔ نامانوس الفاظ تو تصویر کی شکل ہی بگاڑ دیں گے۔ اگر خاکہ نگار لوگوں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو ایسا اُسلوب استعمال کرنا ہو گا جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو یعنی وہ الفاظ کے بدلتے مفہوم اور استعمال سے بخوبی واقف ہو۔ اگر خاکہ نگار کو الفاظ پر عبور ہو گا اور کہنے کا سلیقہ آتا ہو گا تو وہ خاکہ نگاری کے اس مشکل فن سے عہدہ بر آ ہو سکے گا۔ خاکہ نگاری میں شاہد احمد کے اُسلوبِ بیان کی خاص اہمیت ہے۔ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں کہ "اُن کے قلم کو اگر ہم کیمرے کا لینس کہیں تو بے جا نہ ہو گا اور لینس بھی حساس ترین"(۵۹) شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب کی چاشنی اُن کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں پنہاں ہے۔ آپ نے ایسے جملے لیے ہیں جو دل و دماغ میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اُستاد بے خود دہلوی کے خاکے کے اختتام میں شاہد احمد کا اُسلوب ملاحظہ فرمائیں:

"اُستاد بیخودؔ دہلوی بہت جیے۔ ان کے سو سے اوپر ہو کر گئے تھے۔ اُستاد سنچوری پوری نہ کر سکے۔ یک پیری و صد عیب۔ آخر عمر میں طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ یونانی علاج کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے عطّار کے پاں سے نسخہ بندھوا کر لا رہے تھے۔ راستے میں دہی بڑے والا نظر آ گیا۔ آخر دلّی والے تھے، چٹورپن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے۔ اس وقت تو مزا آ گیا، مگر بعد میں اس کی کسر نکلی۔ ضُعف معدہ کے مریض، اسہال شروع ہو گئے۔ بھلا جو شخص ساری عمر اچھے سے اچھے کھانوں کا شوقین رہا ہو وہ ترکِ غذا کیسے کر لے؟ بد پرہیزیاں ہوتی رہیں اور امراض بڑھتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آ کر سلام کیا۔"(۶۰)

- شاہد احمد نے اُستاد بیخودؔ کے آخری ایّام کو نہایت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ استاد بیخودؔ کی شخصی

کمزوری کو بیان کیا اور اس انداز سے کے قاری کو بیخود سے ہمدردی سی ہونے لگتی ہے۔ یہاں پر قاری شاہد احمد کی تبصرہ نگاری سے بے مزہ نہیں ہوتا اور نہ ہی قہقہ لگاتا ہے بلکہ تھوڑا مزا لیتا ہے۔ شاہد احمد کی خاکہ نگاری میں دلّی کی ٹکسالی زبان کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ شاہد احمد کا اُسلوب آپ کو دوسرے خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب کی انفرادیت کا اقرار کرتے ہوئے یحیی امجد لکھتے ہیں کہ:

> "شاہد احمد کی آواز بڑی واضع انفردیت رکھتی ہے خصوصاً ان کا اُسلوب انھیں دوسرے تمام خاکہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے۔ ان کی زبان، بول چال کے قریب تو ہے مگر اشرف صبوحی دہلوی کی طرح عین بول چال کی زبان نہیں بن جاتی۔ ان کے یہاں ایک ادب پارے کی سی متانت ہے اور اس کا وقار ہر لحاظ سے برقرار رہتا ہے۔"(۶۱)

شاہد احمد دہلوی اپنے اُسلوب کے بل بُوتے پر شخصیت کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کے تاثرات میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان کا اُسلوب معمولی سے منظر سے صاحبِ خاکہ کو اُجاگر کرتا ہے۔ شاہد احمد کا مشاہدہ گہرا اور تیز ہے۔ آپ کے پسِ منظر اور فرد میں ہم آہنگی ملتی ہے کیونکہ موضوع شخصیات کو خود انھوں نے دیکھا بھالا ہوا ہے۔ وہ ان سے سرسری واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اُن کو پسِ منظر کی روح تک پہچانتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کے خاکے میں شاہد احمد کے گہرے اور تیز مشاہدے کے ساتھ اُن کا اُسلوب دیکھیے:

> "گھر پہنچے تو دیکھا اُن کے حصّے کے کمرے میں سنّاٹا! نہ بھابی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے چغتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی نہ تھا۔ مین نے آواز دی اور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سکھ دکھائی دیا۔ کڑبڑی ڈاڑھی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہلا تو اس میں سے بدبُو کا ایک بھبکا آیا پایوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹانکے کے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا۔ وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی؟" بولے "بس اب ختم سمجھو۔"(۶۲)

شاہد احمد دہلوی بعض اوقات اپنے خاکوں میں خاکہ نگار کی بجائے کردار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو چپکے چپکے قاری سے محوِ گفتگو ہوتا ہے۔ شاہد احمد کا اپنا مخصوص قلمی مزاج، منفرد لہجہ اور ایک خاص قسم کا

طرزِ بیان ہے۔ آپ کی زبان سادہ، شُستہ اور شگفتہ محاورہ والی ہے۔آپ نے خاکہ نگاری میں استعارات، تشبیہات،ضرب الامثال اور روز مرّہ محاوروں کوانتہائی سلیقہ سے برتا ہے۔آپ کی اس خوبی کو شوکت سبزواری یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"شاہد احمد نے فکر وخیال کے منطقی اصول کے مطابق چھوٹے چھوٹے۔ مختصر اور سادہ جملے استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے عموماً سامنے کے الفاظ لیے ہیں جو روز مرّہ زندگی میں برتے جانے کی وجہ سے سڈول ہوگئے ہیں۔"(۶۳)

شاہد احمد کے ہاں مزاح کا پہلو بھی ہے۔ کبھی کبھار اُن کے اس طنز میں ہلکا پھلکا طنز بھی شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طنز سے صاحب خاکہ کی شخصیت متاثر نہیں ہوتی۔ عظیم بیگ چغتائی کے خاکے شاہد احمد کا طنزیہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

"میں نے کہا" آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے ؟" کہنے لگے "کیوں نہیں ہمارا رجسٹر دیکھو۔ یہ کہہ کر اپنار جسٹر کھول کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چمک کر بولے " پچھلے مہینے چالیس روپے کی آمدنی ہوئی، چھ سو بقایا میں ہیں۔" میں نے کہا" ماشااللہ خوب چل رہی ہے۔"(۶۴)

شاہد احمد دہلوی کی مزاح نگاری میں سنجیدگی بھی نظر آتی ہے اور طنز بھی۔ دونوں کے امتزاج سے جو اُسلوبِ بیان قاری کو پڑھنے کے لیے ملتا ہے وہ پُرلُطف ہوتا ہے۔ آپ نے جوشؔ کے خاکے میں نیاز فتح پوری کے تراجم پر طنز بھی کی ہے۔نیاز فتح پوری نے "گیت انجلی"کا ترجمہ "عرضِ نغمہ "کے نام سے کیا۔شاہد احمد دہلوی کا طنز دیکھیے:

"ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے کے آیا، لگے سب کے سب عرضِ نغمہ کرنے البتہ اتنا اضافہ ٹیگور ہر اور کیا کہ اپنی تحریروں میں بہت سارے آہ—ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے(!)جہاں تہاں ڈال دیے تاکہ پڑھنے والے ان ڈیشوں اور ڈنڈوں سے نفسِ مضمون کی بھیلی پر سر پھٹول کرتے رہیں۔پیاز کو چھیلیے، پرت پرت اُترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کہیں نہیں پائیں گے۔یہی حال اس نیازی یا پیازی ادب کا تھا جسے "ادبِ لطیف" سے موسوم کیا گیا،جو دراصل ہماری نثر کا "چوماچاٹی اور سانڈے کے تیل"کا دور تھا۔"(۶۵)

شاہد احمد دہلوی نے مذکورہ بالا اقتباس میں نیاز فتح پوری پر بھرپور تنقید کی ہے۔ آپ نے نیاز فتح پوری کی "عرضِ نغمہ" کو نام نہاد ادبِ لطیف سے تعبیر کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی طنز و طعن کے تیر چلا کر مخالفین کو زیر کرتے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب میں سلاست، روانی اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ آپ قاری کو اُلجھاتے نہیں ہیں۔ اگر زبان گنجلک ہو گی تو پڑھنے والا اُکتاہٹ محسوس کرے گا۔ شاہد احمد کو پڑھتے ہوئے اُن اُسلوب کی بے ساختگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ قاری کو موضوعِ خاکہ کی اصلیت تک پہنچے میں جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں وہ بہت ہی دل کش ہے۔ میر آجی کے خاکے کا آغاز کرتے ہوئے شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

> "دلّی اور لاہور ہمارے لیے گھر آنگن تھا۔ جب جی چاہا مُنہ اُٹھایا اور چل پڑے۔ کھانے دانے سے فارغ ہو کر رات کو فرنٹیر میل میں سوار ہوئے اور سو گئے۔ آنکھ کھُلی تو معلام ہوا کہ گاڑی لاہور کھڑی ہے۔ سال میں کئی کئی پھیرے لاہور کے ہو جاتے تھے۔ لاہور ادیبوں کی منڈی تھا۔ سر سیّد نے انہیں "زندہ دلانِ پنجاب" کہا اور واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس خطّے مین زندگی اُبلتی ہے اور گنگناتی پھرتی ہے۔ کتنا خلوص تھا یہاں کے لوگوں میں۔ اور کتنی محبت! ٹوٹ کر ملتے، ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے۔"(۶۶)

شاہد احمد دہلوی نے خاکہ نگاری میں فنی لوازم کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ خاکہ نگاری میں ان کے اُسلوب کو بہت ہی مناسب اور موزوں مانا جاتا ہے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان اور الفاظ کا استعمال شاہد احمد نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ مولوی بشیر الدین کے خاکے میں شاہد احمد نے اپنی دادی اماں کے کردار کی ایک جھلک دکھائی ہے ملاحظہ فرمائیں:

> "مجھے تعجب دادی اماں پر ہوتا ہے کہ وہ ایک رئیس کی لاڈوں پلی بیٹی تھیں، انہوں نے اس مفلسی اور تنگدستی کو خندہ پیشانی سے کیسے انگیز کر لیا؟ کوئی اور سوال کی ہوتی تو کبھی کی دھتا بتا چکی ہوتی۔ مگر نہیں، شریفوں کا یہی دستور تھا کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں دے دیا اُسی کو اپنا مجازی خدا مان لیا۔ مرنا بھرنا ان کا اصول تھا۔ جس گھر میں لڑکی کا ڈولا آتا تھا اُس گھر سے پھر اُس کی کھاٹ ہی نکلتی تھی۔"(۶۷)

شاہد احمد کے خاکوں میں دلّی کی فصیح اور بامحاورہ زبان کا بہت بڑا حصّہ ہے اور یہ چیز شاہد احمد کو ورثہ میں

ملی تھی۔ آپ نے اس وراثتی خصوصیت کو اپنی خاکہ نگاری میں خوب برتا۔ آپ الفاظ کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ شاہد احمد نے شخصیات کے معائب اور محاسن کو انتہائی سلیقے اور توازن سے بیان کیا اور اس بیان میں کچھ شخصیات ان کے تیکھے جملوں کی زد میں بھی آئیں۔ شگفتگی اور لطیف طنز آپ کے اُسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔ شاہد احمد دہلوی زندگی کے اونچ نیچ کو بھی انوکھے انداز میں بیان کیا ہیں۔ حکیم کیف کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے شاہد احمد نے ان کے مطب اور عیش و عشرت کو کمال عمدگی سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"حکیم کیفؔ کا مطب کیا تھا عیاّشوں کا اڈا تھا۔ خود حکیم صاحب دونوں ہاتھوں سے جوانی لُٹاتے تھے۔ چاوڑی میں حکیم کیفؔ کی دھوم مچی رہتی تھی۔ فخریہ فرماتے تھے کہ لیلیٰ قیس قیس پکارتی پھرتی تھی۔ طوائفیں کیف کیف پکارتی پھرتی ہیں۔"(۶۸)

حکیم کیفؔ کے زمانہ عروج کے بعد شاہد احمد دہلوی نے اُن کے زوال کی داستان کو بھی اس قدر المناک انداز سے بیان کیا ہے کہ کیفؔ سے ہمدردی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہد صاحب کے اُسلوب کی ایک اور امتیازی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ موضوعِ خاکہ اور قاری کے درمیان تعلق کو کسی بھی مقام پر کمزور نہیں ہونے دیتے۔ خامی کو بیان کرنے کے فوراً بعد ایسا واقعہ لے کر آتے ہیں کہ قاری صاحبِ خاکہ کا گرویدہ ہو جاتا ہے یا پھر اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ حکیم کیفؔ کی عیاشیوں کے بعد آخری ایّام کا ذکر شاہد احمد کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ:

"پھیپھڑے گل گئے تھے، شہ رگ پھول گئی تھی۔ دل کی رفتار مین فرق آ گیا تھا۔ ڈھیروں خون تھوکتے تھے۔ آخر میں گلا بھی بند ہو گیا تھا۔ ناک میں سے ربڑ کی نلکی معدہ میں ڈال دی گئی تھیجس سے دودھ یا عرق کے دو چمچے پچکاری کے ذریعے داخل کیے جاتے۔ افّوہ! یہ مرنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ موت نہ جانے کہاں ٹل گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ان کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ تنفّس رک جاتا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا۔"(۶۹)

شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب میں دلّی کا بانکپن ہے۔ خاکہ نگاری میں ان کا فن یکتا ہے۔ آپ کے خاکے پڑھتے ہوئے دل بھرتا نہیں بلکہ تشنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ کی ایک خوبی آپ کی راست بازی بھی ہے۔ آپ نے ہمیشہ ادیبوں کی خدمات کے بیان میں سچائی کے پہلو کو مدِ نظر رکھا۔ نہ کسی کو زیادہ بڑھا چڑھا کر سامنے لاتے ہیں اور نہ ہی کسی کے درجے میں کمی آنے دیتے ہیں۔ آپ واقعات کی کڑیوں سے موضوعِ خاکہ

کی تصویر بناتے ہیں اور باقی ذمہ داری پڑھنے والے پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کو خود سے کوئی عنوان دے دے۔ خاکہ تحریر کرنے کے لیے شخصیت کا گہرا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ اُس کے نظریات کیا ہیں، عادات و اطوار کیسی ہیں۔ حلقہ احباب اور معاشرے میں اُس کا مقام کیا ہے ان سب باتوں کا جاننا ایک لکھاری کے لیے از حد ضروری ہے۔ اس بابت شاہد احمد کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ وہ شخصیات کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ اُس کی ذہنی کیفیات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ صاحبِ خاکہ کے اوصاف، اس کے حالاتِ زندگی، مزاج اور ادبی کارناموں کو ایک دل کش اُسلوب سے بیان کر کے قاری کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بلا حیل وحجت یہ کہہ اُٹھتا ہے اس شخصیت سے تو وہ بخوبی واقف ہے۔ جگرؔ مراد آبادی کی خاکہ نگاری میں شاہد احمد نے اُن کی شخصیت کو کس دل کش اُسلوب میں بیان کیا ملاحظہ فرمائیں:

> "بڑے خوش خط تھے جگرؔ صاحب۔ جو انداز پُرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اُسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی مگر موتی جڑ دیے تھے، اختتام پر اپنے نام کا طُغرا بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبانِ قلم سے ٹپکتی تھی۔ کتنی خوبصورتی چھُپی ہوئی تھی اس ظاہرہ بد شکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سُنائی۔ نُور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کیا آب حیواں کی طرح دُنیا کی تمام بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں؟۔"(۷۰)

شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب نگارش کی سے ہلکی پھلکی شوخی بھی جھلکتی ہے اور کبھی کبھار ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ موضوعِ خاکہ کا نہیں بلکہ اپنا درد سُنا رہے ہیں۔ ادب کے ساتھ شاہد احمد کا رشتہ خلوص کا تھا۔ آپ کے اُسلوب کی یہ انفرادیت ہے کہ آپ شخصیات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ اُس کی معمولی باتوں سے نتائج حاصل کرتے ہیں اور بڑی سادگی سے گہری باتیں کر جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور مکالموں سے آپ ایسا ماحول پیدا کرنے کے ماہر ہیں جس کی بدولت قاری موضوعِ خاکہ کو اپنے سامنے اور محوِ گفتگو پاتا ہے۔ بندو خان کے خاکے میں آپ نے اُس کے درویشانہ مزاج وعادات، سادگی، کنبہ پروری اور باطنی کیفیات کو جس عمدہ اُسلوب سے پیش کیا ہے وہ آپ کی فنی مہارت کا آئینہ دار ہے۔ بندو خان کے شخصی اوصاف کے بیان میں شاہد احمد دہلوی کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

> "مرتے دم تک مزاج درویشانہ پایا تھا۔ روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں کی، جو کچھ کمایا۔ اتاں کو دیا اور اتاں کے مرنے کے بعد بیوی کو، غریب کُنبہ داروں کی امداد

> کرتے رہتے تھے۔ کسی عیب میں نہیں تھے۔ چانڈو پینے کی لت نہ جانے کہاں سے لگ گئی تھی۔ اس میں البتہ کچھ روپیہ ضائع ہوا اور صحت کو بھی نقصان پہنچا۔ بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے اور باتیں بھولی بھالی کرتے تھے۔ منکسر المزاج اتنے کہ کبھی آنکھ ملا کر بات نہ کرتے تھے۔"(۷۱)

شاہد احمد دہلوی کے اُسلوب میں پائی جانے والی لذت اور چاشنی مذکورہ بالا اقتباس میں عیاں ہے۔ آپ نے بندو خان کے دل میں دوسروں کے لیے پائی جانے والی محبت اور خلوص کو اُجاگر کیا۔ اُس کے درویشانہ مزاج، ماں سے محبت، اقربا پروری اور بھولے پن کو کو بیان کرنے کے لیے جس طرح کا لب ولہجہ آپ نے اپنایا وہ قابلِ تعریف ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا تعلق اُن خاکہ نگاروں سے ہے جو فنی نزاکتوں کا بھرپور خیال رکھتے ہیں اور کسی اور کی پیروی نہیں کرتے۔ الفاظ اور جملوں کی مدد سے شخصیات کی تصاویر بناتے ہیں اور ہر تصویر دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کے خاکے میں شاہد دہلوی نے جن الفاظ اور جملوں کو چُنا اُن میں شوخی اور شگفتگی جھلکتی ہے اور قاری خاکہ کو پڑھتے ہوئے محظوظ ہوتا ہے۔ شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

> "چغتائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔" بڑے بھائی ملے، خوب تندرست و توانا۔ معلوم ہوا کہ آپ تھرڈ کلاس وکیل ہیں۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی الجثہ، مزاجاً صوفی۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چغتائی صاحب کی شکل کے مگر صحت اچھی۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ آپ کیا کرتے ہیں؟" فرمایا" رہتا ہوں۔" نیچے کے چار دانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی قد میں سب سے بڑے، ماشاالله دیوزاد، یہ لمبا تڑنگا جوان۔ معلوم ہوا کہ آپ کو دق ہے۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے مرزا صاحب سے پوچھا۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار دانت غائب؟ کہنے لگے۔" کہ ایک دانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انہی چار دانتوں سے پائیوریا ہوتا ہے۔ بس سب نے اُکھڑ ڈالے۔ جب عصمت چغتائی ملے تو سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار دانت تو غائب نہیں؟ بحمد الله ان کے سارے دانت برقرار تھے۔"(۷۲)

شاہد احمد دہلوی خاکے کا آغاز بھی منفرد انداز سے کرتے ہیں۔ آپ صاحبِ خاکہ کے تعارف کے لیے جو اُسلوب اپناتے ہیں وہ قاری کے تجسس کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔۔ ایم اسلم کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے شاہد احمد

دہلوی نے سرزمینِ پنجاب کی خوب صورت منظر نگاری کی ہے اور ایم اسلم اور سرزمینِ پنجاب کے تعلق کو دل کش انداز سے جوڑا ہے۔ پسِ منظر کے ساتھ شخصیت کا تعارف آپ کے انوکھے اُسلوب کی پہچان ہے۔ ایم اسلم کے خاکے میں آپ نے پنجاب کی سرزمین کی صفات کو بیان کیا ہے۔ شہر اور دیہات کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ پنجاب کے لوگوں کی روح کی توانائی اور محنت و جفاکشی کی تعریف بھی کی ہے۔ ایم اسلم اور پنجاب کی سرزمین کے بیان کے لیے جو سلیس اور سادہ اُسلوب آپ نے اپنایا ہے اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

"سرزمینِ پنجاب اپنی بوقلموں صفات کی بنا پر سدا سے ہندوستان کی ایک بیش قیمت دولت رہی ہے۔ اس کے شہروں کی زندگی گنگناتی رہتی ہے۔ اور اس کے دیہاتوں کی آبادی ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ شیشم کے سائے میں محبت کے پودے پنپتے ہیں اور رومانی جھیلوں میں حُسن و عشق کے کنول کھلتے ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہنیوال، سسی پنوں کے عشقیہ ناٹکاسی سرزمین کے سٹیج پر کھیلے گئے اور اس دل سوزی کے ساتھ کہ رہتی دنیا تک اُن کے نام زندہ رہیں گے۔ سچ ہے کہ عشق میں جان دے کر انسان زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔"(۷۳)

شاہد احمد دہلوی مذکورہ بالا اقتباس میں پنجاب کی منظر نگاری کے بعد ایم اسلم کو قاری سے ملوایا۔ شاہد احمد کے اُسلوب نگارش کی یہ پہچان ہے کہ وہ پہلے اپنے اُسلوب کے زور پر قاری کے تجسس کو اُبھارتے ہیں پھر موضوعِ خاکہ کو پیش کرتے ہیں۔ شاہد احمد کبھی گفتگو کا انداز اپنا لیتے ہیں اور کبھی خود کلامی کرنے لگتے ہیں۔ یوں یادوں کے دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور شخصیت کا بیان مکمل ہو جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے شخصیات کے آخری سفر کو بیان کرنے کے لیے جو اُسلوب نگارش اپنایا وہ بھی سب سے الگ تھلگ ہے۔ آپ نے موت کو انتہائی مختصر مگر پُر اثر اور الم ناک انداز سے بیان کیا ہے۔ قاری ابھی صاحبِ خاکہ کے ساتھ جُڑے واقعات کے سحر میں ہی مُبتلا ہوتا ہے کہ آپ انتہائی ہوشیاری سے موضوعِ خاکہ کی خرابی صحت کو بیان کر کے اس کی موت کی وجہ کو بیان کر دیتے ہیں اور خاکہ اختتام پزیر ہو جاتا ہے۔ موضوعِ خاکہ کی موت کے لیے آپ جس طرح کا اُسلوب اپناتے ہیں اُس سے قاری صاحبِ خاکہ سے بچھڑتے ہوئے خوشی اور غم کی ملی جُلی کیفیت میں ہوتا ہے۔ مولوی عنایت اللہ کے آخری وقت کو شاہد احمد دہلوی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"دہرہ دون کے اگلے پھیرے میں معلوم ہوا کہ مولانا دلّی گئے ہوئے ہیں۔ آپریشن کرانے کی ضرورت تھی مگر اُن میں اس کا دم نہ تھا۔ دہرہ دُون واپس آ کر موت کا

انتظار کرنے لگے۔ایک دن پائیں باغ میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ کھانسی اُٹھی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بہت دیر بعد بوڑھا مالی اُدھر آیا تو مولانا کے ڈھلکے ہوئے سر کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ قریب جا کر دیکھا تو مولانا ابدی نیند سو رہے تھے۔"(۷۴)

شاہد احمد دہلوی ایک خاکہ نگار کو اپنی بات کرنے کا ڈھنگ سکھاتے ہیں ۔ آپ کا بیان ایسا ہوتا ہے کہ بات مکمل ہو جاتی ہے اور شگفتگی بھی باقی رہتی ہے۔شاہد احمد کے اُسلوب کی دل کشی اور شگفتگی کی بدولت بات اپنا بھرپور تُاثر چھوڑ جاتی ہے۔ آپ کے ہاں نہ تو انگریزی کے الفاظ ملتے ہیں اور نہ ہی عربی اور فارسی کے بلکہ دلّی کی ٹکسالی زبان پوری شان و شوکت اور گھن گرج کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے محاوروں اور لفظوں کا استعمال اس انداز سے کیا ہے ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے الفاظ قاری کو تھپکی بھی دیتے ہیں اور جنجھوڑتے بھی ہیں۔ شاہد احمد دہلوی اپنے اُسلوب کی طاقت سے الفاظ کے ذریعے شخصیت کی تصویر کو مکمل کر کے پیش کرتے ہیں۔

واقعات نگاری

خاکہ نگاری میں شخصیات کو واقعات کی مدد سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ ایک خاکہ نگار موضوعِ خاکہ کے متعلق حقیقی واقعات کو بیان کرتا ہے۔ اس ضمن میں خاکہ نگار ان واقعات کو ترجیح دیتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے ہوں۔ بے شمار واقعات میں سے خاکہ نگار واقعات کا انتخاب کر کے صاحبِ خاکہ سے متعلق اُن اہم واقعات کو بیان کرتا ہے جن سے شخصیت کو اُبھارا جا سکے ۔ دوسری صورت میں خاکہ طویل ہو جائے گا اور خاکے کا مجموعی تاثر کمزور پڑ جائے گا۔ واقعات کے انتخاب میں ایک خاکہ نگار دل چسپی کے عنصر کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ ایک خاکہ نگار کے لیے ایک اچھا واقعہ نگار ہونا بہت ضروری ہے۔ واقعات کو ڈھنگ سے بیان کرنے کا ہنر خاکے میں جان پیدا کرتا ہے۔ اگر خاکہ نگار واقعہ کے وقت، مقام، ماحول اور جزئیات کو دانش مندی سے بیان کرے گا تو صاحبِ خاکہ کی مکمل صورت قاری کے سامنے لانے میں کامیاب ہو گا ورنہ تصویر اُدھوری رہے گی۔ ایک ماہر خاکہ نگار اپنے قلم کی طاقت سے واقعات کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا وہ واقعہ رُونما ہو رہا ہے اور قاری اُس کو دیکھ رہا ہے۔ بعض اوقات خاکہ نگار شخصیت سے جوڑے معمولی واقعات کو اس مہارت سے بیان کرتا ہے کہ بڑے واقعات ان معمولی واقعات کے مقابلے میں ہیچ لگتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں واقعات کی ضرورت و اہمیت کو یحییٰ امجد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"خاکہ ایک تخلیقی صنفِ ادب ہے جس میں زندہ شخصیت، گوشت پوست کا بدن لیے، علمیت کی بھاری بھر کم عباؤں کو دم بھر کے لیے اُتار کر، روز مرّہ کے لباس میں نظر آتی ہے اور ہم انھیں ایسا دیکھتے ہیں جیسا وہ سچ مچ تھے نہ کہ جیسا ظاہر کرتے تھے۔"(۷۵)

واقعات نگاری میں ایک خاکہ نگار کو توازن کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شخصیت سے بے شمار واقعات جُڑے ہوتے ہیں۔ اگر ایک عام شخص کی نظر میں کچھ واقعات اہم ہوتے ہیں اور کچھ واقعات کی حیثیت معمولی نوعیت کی ہوتی ہے مگر ایک خاکہ نگار کے لیے کچھ واقعات کا اہم اور معمولی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا وہ صرف اور صرف ان واقعات کو منتخب کرتا ہے جو شخصیت کو اُجاگر کر دیں۔ ایک خاکہ نگار اس امر کا خاص خیال کرتا ہے کہ واقعات کی عام لوگوں کے لیے کیا اہمیت ہے اور کیا یہ واقعات لوگوں کے لیے نئے تو نہیں ہے۔

شاہد احمد نے بھی "گنجینہ گوہر" میں شخصیات کی خاکہ نگاری کرتے ہوئے واقعات کی مدد لی ہے۔ واقعات کے انتخاب اور واقعہ نگاری میں آپ کو خاص مہارت حاصل ہے۔ آپ کے خاکوں میں بیان کردہ واقعات آپ کے حسنِ انتخاب کی واضح دلیل ہیں۔ آپ معمولی واقعات کی مدد سے شخصیات کی حقیقی تصاویر سامنے لاتے ہیں۔ منٹو کے خاکے میں آپ نے ایک معمولی واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ منٹو کی نفسیاتی کیفیت قاری کے سامنے آشکار کر دی۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"اگست سن ۱۹۵۴ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، اڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ ان کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ تو بیمار ہیں۔ آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اُٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔ "بولے ہاں بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سُنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا۔ "اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی "اوے ادھر آ۔ "وہ رُکتا جھجکتا آ گیا۔ کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال۔ "اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کیے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے۔ "حرام زادے دس روپے تو دے۔ "یہ کہہ کر اُس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔"(۷۶)

شاہد احمد دہلوی نے خاکہ نگاری کے ذریعے تاریخی معلومات اور روایات کو محفوظ بنانے کی سعی کی ہے۔

آپ نے جن شخصیات کی مُرقع نگاری کی ہے ان کے کردار، زبان، رہن سہن، اُٹھنے بیٹھنے کے طریقوں اور قدیم ماحول کو واقعاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ دراصل آپ واقعات کی مدد سے شخصیت کو اُجاگر کر کے تمام معلومات کو محفوظ بنانا چاہتے تھے۔ مولوی بشیر الدین احمد کے خاکے میں آپ نے صاحبِ خاکہ کی شخصی خصوصیات، عادات اور دلّی کے کلچر کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> "میرے والد بڑے محنتی آدمی تھے، گرمیوں میں صبح ناشتہ کر کے لکھنے پڑھنے کے کام پر جم جاتے۔ میز کرسی نہیں فرش پر بیٹھتے تھے۔ صدر دالان میں چاندنی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ، آگے لمبی سی نیچی میز، ٹیز پر کاغذوں کے انبار، دونوں پہلوؤں میں کتابوں کے ڈھیر، بائیں طرف بڑے سے تھال میں حقّہ جس کی سٹک ان کی گود میں میں پڑی رہتی۔ ایک لڑکا صرف حقّے پر نوکر تھا۔ اس کا یہ کام تھا کہ صبح سے رات گئے تک حقّے تازہ کرتا رہے اور چلمیں بھرتا رہے بیسوں قسم کے حقّے گھر میں تھے۔ لکھنؤ کے ہر دم تازہ اور گڑگڑی سے لے کر نصف قد آدم تک کے حُقّے۔ ایک حُقّہ چاندی کا بھی تھا جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالا جاتا تھا۔"(۷۷)

شاہد احمد نے اپنے والد کی روزمرّہ مصروفیات و معمولات کو دلکش انداز میں لکھا ہے۔ واقعہ میں آپ نے مولوی بشیر الدین کی مصروفیت اور معمولات زندگی کے ساتھ ساتھ قدیم دلّی کی تہذیب کی بھی ایک جھلک قاری کو دکھائی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں صاحبِ خاکہ کی علم دوستی اور عادات واطوار کا بیان بھی ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنے والد کو ایک آسودہ حال شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ اس طرح کا رہن سہن دلّی کے اُمراء کا ہوتا تھا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شاہد احمد دہلوی نے اس واقعہ کو تمام تر اجمالی حُسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ واقعہ کو اس انداز سے بیان کرنے کا ملکہ شاہد احمد دہلوی کا خاصہ تھا کیونکہ اس طرح کا بیان قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ شاہد احمد صاحبِ خاکہ کی زندگی کو اتنے جامع انداز سے بیان کرتے ہیں کہ کوئی گوشہ نہیں بچتا۔ شاہد احمد خاکہ لکھتے ہوئے جہاں واقعہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں بیان کر دیتے ہیں۔ آپ نے خاکوں میں مکالمات کسے بھی کام لیا ہے۔ خواجہ حسن کے بیان میں آپ نے مختلف واقعات کی مدد سے ان کی شخصیت کے چھپے پہلوؤں کو قاری کے سامنے رکھا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے خواجہ صاحب کا جو واقعہ یہاں نقل کیا ہے اس میں اُن کو ایک مہمان نواز اور محفل پسند شخصیت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ خواجہ حسن اپنے گھر میں محفلوں کا بھرپور اہتمام کرتے تھے اور ان محفلوں میں ہر طرح کے لوگوں کو مدعو کرتے تھے۔ درج

ذیل واقعہ میں شاہد احمد نے خواجہ حسن کی مذہبی رواداری کو بھی اُجاگر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ دلّی کے ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سارے ایڈیٹروں کو آموں اور آئس کریم کی دعوت دی۔ بڑا عمدہ انتظام کیا۔ اعلےٰ درجے کے سرولی آم کھلائے اور بڑی خوش ذائقہ آئس کریم۔ انگریزوں کو قوالی سنوانا تو اُن کے لیے ایک عام بات تھی۔ سترھویں کے موقع پر عرس سے ایک دن پہلے خواجہ صاحب میدانِ عرفات میں اپنے انتظام سے قوالی کراتے تھے۔ انہوں نے اپنے احاطوں اور کمروں اور زمینوں کے عجیب عجیب نام رکھے تھے۔ ان ہی میں سے ایک احاطہ کا نام میدانِ عرفات تھا۔ ایک وادیٔ ایمن تھی۔ ایک ایمان خانہ تھا۔ خود جس جگہ رہتے تھے اس کا نام رہن بسیرا تھا۔ قوالی میں شہر اور باہر کے تمام مشہور آدمی مدعو ہوتے تھے۔ ہندو اور سکھ بڑی عقیدت سے اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔"(۷۸)

شاہد احمد دہلوی واقعات کو بیان کرتے ہوئے صاحبِ خاکہ سے عقیدت کا دم بھی بھرتے ہیں۔ آپ کے انداز کی بدولت قاری کو بھی صاحبِ خاکہ سے عقیدت ہونے لگتی ہے۔ آپ واقعات سے شخصیت کی عظمت و شرافت اُجاگر کرتے ہیں اور اس ضمن میں شاہد احمد دہلوی توازن اور اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتے۔ آپ کے یہاں واقعات کا ایک تسلسل ہے۔ آپ کے ہاں زمانی ترتیب نظر نہیں آتی۔ بشیر الدین احمد کے خاکے میں آپ نے ان کے ملازمین سے اُن سے برتاؤ کو دیکھ کر قاری ان کا معتقد ہو جاتا ہے۔ بشیر الدین احمد ایک لکھاری تھے ان کے پاس کئی کاتب کتابت پر مامور تھے۔ آپ کا ان کے ساتھ روّیہ ہمیشہ مخلصانہ رہا۔ شاہد احمد نے بشیر الدین احمد کے ایک ملازم غیاث الدین کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے والد کی طبیعت اور غیاث الدین کے ڈھیٹ پن کو بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"دادا ابّا اور ابّا کی کتابیں لکھنے کے لیے کئی کاتب ہمارے مردانے گھر میں ہی بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خوش نویس غیاث الدین بھی تھا جو خوش خط تو بہت تھا مگر بڑا غیر ذمہ دار۔ اُجرت ملتے ہی کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتا۔ ابّا اس کے تساہل کو اس کی خوشخطی کی وجہ سے ٹال جاتے۔ مگر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔ غیاث الدین بہانے بنا کر پیشگی رقم لے جاتا اور کام پر بھی نہ آتا۔ ابّا خفا ہوتے تو مُسمسی صورت بنا کر کبھی اپنے باپ کے مرنے کی خبر دیتا اور کبھی اپنی ماں کے فوت ہونے کی۔ غرض رفتہ رفتہ اس نے اپنے تمام بڑوں کو مار ڈالا۔"(۷۹)

شاہد احمد دہلوی واقعہ نگاری کرتے ہوئے کسی خاص ترتیب کے قائل نظر نہیں آتے۔ وہ ایک واقعہ کی مدد سے قاری کو صاحبِ خاکہ سے ملواتے ہیں اور فوراً بعد ہی ایک دوسرا واقعہ لے آتے ہیں۔ شاہد احمد نے جگرؔ مراد آبادی کے خاکے میں ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مشاعرے میں کلام پیش کرنے کا حال سُنایا۔ واقعے میں جگرؔ کی شاعری اور منفرد اعادات کو قاری کے سامنے پیش کیا۔ جگرؔ مراد آبادی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی نے نیاز فتح پوری اور جگر مخاصمت کے واقعے کو خاص طور پر بیان کیا۔ آپ نے جگرؔ کی علمی وادبی خدمات کے ساتھ ساتھ جگرؔ کی کثرتِ مے نوشی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جگرؔ مراد آبادی کی ازدواجی زندگی کے مسائل، بیوی سے علیحٰدگی اور دوبارہ شادی کے واقعے سے شاہد احمد نے خاص طور پر بیان کیا ہے۔ نیک اور پاک باز بیوی نے کس طرح ان کی زندگی کو بدل دیا۔ واقعہ ملاحظہ کیجیے:

> "اصغر صاحب کے انتقال کے بعد جگرؔ صاحب کو ان کی بیوہ اور اپنی سابقہ بیوی سے محبت ہو گئی۔ عدت پوری ہونے کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ انہوں نے فرمایا" شراب چھوڑدو"۔ اس اللہ کے بندے نے شراب چھوڑ دی۔ بڑی بُری بُری حالتیں ہوئیں مگر نیت نیک تھی۔ ساحلِ مراد پر زندہ ہی پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شادی کے بعد جگرؔ صاحب نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ رندی و سرمستی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک زاہدِ خشک بن گئے تھے۔ مگر اس زُہد اتّقا میں اُن کا دلِ زندہ مرنے نہیں پایا تھا۔ طبیعت کی مُستقل خرابی کے باوجود وہ خوب ہنستے بولتے تھے۔ گھنٹوں برج کھیلا کرتے تھے۔ مُشاعروں اور ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اخلاق اور بھی نکھر گیا تھا۔"(۸۰)

میر آجی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی واقعات کو بیان کرتے ہوئے بتدریج آگے بڑھتے ہیں اور ہر واقعہ میں صاحبِ خاکہ کی کوئی نہ کوئی خوبی قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ شاہد احمد واقعہ کو پسِ منظر میں لے جا کر مکالمہ لانے کے بھی ماہر ہے۔ میر آجی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی اس طرح کی صورت حال بپا کی ہے۔ آپ نے خاکے کی ابتداء میں لاہور اور دلّی کی ثقافت کو ایک جیسا قرار دیا ہے اور لوگوں کی بے لوث محبت کو بیان کیا ہے۔ ابھی قاری شاہد احمد ان مکالموں کا ہی مزا لے رہا ہوتا ہے کہ آپ میر آجی کی پر اسرار موت کو بیان کر دیتے ہیں۔ اب افسردگی کے اثر کی کمی کے لیے آپ مختلف واقعات کو بیان کرتے ہوئے میر آجی کی چھپی شخصیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ شاہد احمد کا کمال یہ ہے آپ واقعات کو اپنے مشاہدہ کی قوت سے بیان کرتے ہیں

اور شخصیت کے اسرار تک پہنچ جاتے ہیں ۔ آپ نے میر آجی کی شاعری، ریڈیو کے لیے خدمات ،ان کی مئے نوشی کے واقعات کو ان کے خاکے میں بیان کیا ہے۔ کثرتِ مے نوشی کی بدولت میر آجی کی صحت بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ شاہد احمد نے میر آجی کی شخصیت کو پُر اسرار کہا ہے۔ میر آجی کا لباس، وضع قطع اور باتیں سبھی کچھ نِرالا تھا لیکن تھے وہ بہت بے ضرّر انسان۔ شاہد احمد نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں میر آجی کی کسی کے ساتھ لڑائی کا ذکر ہے۔۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک دن ریڈیو اسٹیشن پر میر آجی کو دیکھا کہ جگہ جگہ سے ان کا منہ سُوجا ہوا ہے اور سارے چہرے پر زخم نُہٹّے لگے ہوئے ہیں ۔ میں نے گھبرا کر پوچھا، "میر آجی کیا گر پڑے۔ "بولے "نہیں، مجھے مارا ہے۔ "آپ کو کیوں مارا؟ آپ تو لڑنا جانتے ہی نہیں ۔ "کہنے لگے "مجھے سوتے میں مارا ہے اُس نے۔ "کس نے ؟" میرا شبہ ہے ایک آدمی پر"۔ اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اُس بیہوش آدمی کو کس ملعون نے مارا تھا!"(۸۱)

شاہد احمد دہلوی خاکے کے دیگر لوازم کی طرح واقعہ نگاری میں بھی دوسرے خاکہ نگاروں سے آگے نظر آتے ہیں۔ آپ نے خاکہ نگاری میں چھوٹے چھوٹے واقعات کا منتخب کیے اور پھر پُر اثر الفاظ کا جامہ پہنا کر ان واقعات کو غیر معمولی بنا دیا۔ آپ نے الفاظ کی تاثیر سے صاحبِ خاکہ کا پُر تو قاری کے سامنے پیش کیا۔ عظیم بیگ چغتائی کے خاکے میں شاہد احمد دہلوی ایک اثر انگیز واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

"چغتائی صاحب کی شادی رام پور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چغتائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا بُرقعہ اُتروا دیا اور انہیں کُھلے بندوں اپنے ساتھ لانا لے جانا شروع کر دیا۔ اس وضع سے انہیں اپنی سُسرال رام پور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کی اور سُسرال والوں کی تنا تنی ہو گئی۔ مصیبت بے چاری بیگم چغتائی کی! باپ بھائیوں کو یہ زعم کہ لڑکی بھلا ہمارے کہنے سے باہر کیسے ہو سکتی ہے۔ ادھر بگڑے دل مرزا کہ جان چلی جائے آن نہ جانے پائے۔ اَڑ گئے کہ صاحب وہی ہو گا جو ہم کہتے ہیں۔"(۸۲)

مذکورہ بالا اقتباس میں شاہد احمد نے چغتائی صاحب اور ان کے سُسرال کی تنا تنی کے واقعہ کو دل چسپ شکل دی ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کی مدد سے ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو بیان کرتے ہیں

۔ آپ کسی بھی واقعہ کو جوں توں بیان کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ آپ الفاظ کی مدد سے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ قاری کو واقعہ پڑھتے ہوئے لطف محسوس ہوتا ہے۔ آپ کا مشاہدہ بلا کا گہرا اور تیز ہے۔ چونکہ اکثر واقعات آپ کے دیکھے بھالے ہیں اور آپ اُن واقعات کو پسِ منظر کی روح تک پہچانتے ہیں اس لیے آپ کے بیان کردہ واقعات میں ہم آہنگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاہد صاحب نے منٹو کے خاکہ نگاری میں دیوندر ستیار تھی اور منٹو کی مخاصمت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ منٹو کو تصنع اور بناوٹ سے بہت چِڑ تھی اور منٹو ایسے لوگوں کو کھری کھری سُنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ شاہد احمد اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ اس واقعہ کی بدولت قاری کو بیک وقت دیوندر ستیار تھی اور منٹو دونوں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

> "یادش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیار تھی۔ تھے کیا اب بھی ہے اور اردو اور ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی پر بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں ۔اسی زمانے میں وہ دلّی آئے تو انہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چڑایا۔۔۔۔ہاں تو ستیار تھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کر کیے۔ ابتداء میں تو سب نے لحاظ مروّت میں چند افسانے سُنے پھر کنّی کاٹنے لگے۔ پھر انہیں دور سے ہی دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا نہیں تھا۔۔۔اس کے بعد مغلّظات سنانا شروع کر دیں۔ مگر صاحب مجال کہ ستیّار تھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اُسی طرح مسکراتے رہے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔"(۸۳)

شاہد احمد دہلوی کی خاکوں میں ان کی ذاتی پسند اور ناپسند کی جھلک نظر نہیں آتی اور نہ ہی صاحبِ خاکہ سے ان کی محبت یا نفرت کا احساس ہوتا ہے۔ شاید احمد نے واقعہ نگاری میں معروضیت کو پیش نظر رکھا۔ جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کر دیا۔ آپ کے بیان کردہ واقعات میں عقیدت کی بھی کو جھلک نظر نہیں آتی۔ آپ کا واقعہ کو بیان کرنے کا انداز منفرد ہے۔ ہر بات کو بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ آپ نے واقعات کی مدد سے قاری کے تجسس کو اُبھارا ہے۔ جیسے جیسے واقعہ آگے بڑھتا جاتا ہے تجسس میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے جو تمہید باندھتے ہیں وہ قاری کو بے چین کر دیتی ہے اور اختتام تو چونکا کر رکھ دیتا ہے۔ مرزا محمد سعید کے خاکے میں شاہد احمد نے پطرسؔ سے وابستہ ایک واقعہ کے ذریعے قاری کے تجسس کو خوب اُبھارا۔ قاری ہر لمحہ اگلی بات جاننے کا متمنی تھا۔ شاہد احمد لکھتے ہیں کہ:

"پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل ہو گئے مگر پرانے دوستوں سے رسم و راہ میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا تھا۔ مرزا صاحب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ ریڈیو سے کبھی کبھی تقریر نشر کیا کریں۔ دو ایک تقریروں کے بعد مرزا صاحب نے کانٹریکٹ واپس کرنے شروع کر دیے۔ شدہ شدہ بات پطرس تک پہنچی۔ حاضر ہو کر وجہ دریافت کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا" تمھیں اصلاح دینے کے بعد مجھے یہ منظور نہیں کہ تمھارے شاگرد مجھے اصلاح دیں ۔۔ حسبِ دستور اس نے اپنی کارروائی دکھانے کے لیے اُس نے اُن کے مسودے میں سے دو ایک فقرے نکال دیے تھے۔۔۔ معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، مرزا صاحب نہ مانے۔ بولا۔"تو حضرت میری نوکری گئی۔ بال بچے بھوکے مریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔ مرزا صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ بولے۔" یہ تو میں نہیں چاہتا۔"اس نے کہا۔"اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کانٹریکٹ پر دستخط کیجیے۔ مرزا صاحب نے فوراً دستخط کر دیے۔"(۸۴)

شاہد احمد نے اپنی خاکہ نگاری میں شخصیات کی اجتماعی زندگی ، سماجی رشتوں، تہذیبی عوامل اور معاشرتی رسم و رواج کو واقعات کی مدد سے دکھایا ہے۔ آپ نے واقعات کو دل کشی کے عنصر کو بھی شامل کیا ہے۔ کسی بھی شخصیت کا خاکہ پڑھتے ہوئے قاری اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے مثبت کے ساتھ منفی پہلو بھی اُجاگر کیے۔ جالبی صاحب کے خاکے میں شاہد دہلوی نے جوش صاحب کے شوقِ طعام کو بیان کرتے ہوئے جو واقعہ قارئین کی نذر کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

"یادش بخیر! حضرت جوش ملیح آبادی کھانے پینے کے بڑے رسیّا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں صرف پینے کے،، جی نہیں، کھانے کے بھی۔ مجھے چند بار انہیں کھاتے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس معاملے میں وہ قطعی غیر شاعر ہیں۔ آپ بڑی بے دردی سے کھانے پر پلتے ہیں۔۔۔۔ دو گھنٹے کے اس ریاض کے بعد کھانا طلب کیا جاتا ہے۔ اب آپ ان کے تناولِ طعام کی رفتار دیکھئے۔ بریانی کی چوٹی دار قابیں آتیں رہیں گیا ور غائب ہوتی رہیں گی۔ قورمہ اور شیر مالیں پناہ مانگ جائیں گی۔ آم کی گھٹلیوں کا ڈھیر لگ جائے گا اور ہلاکو کے کھوپڑیوں کا مینار کی یاد تازہ کر جائے گا۔ جوش صاحب کی اس خوش خوری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم ایک شخص تو ہماری برادری میں ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے۔"(۸۵)

شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں کچھ ایسے واقعات کو بھی بیان کیا ہے جو دلّی کی قدیم ثقافت کے عکاس ہیں۔ شاہد احمد کا دلّی سے قلبی تعلق تھا۔ اس لیے اس طرح کے واقعات کو نظر انداز کرنا شاید ان کی طبعِ نازک کے لیے ممکن نہ تھا۔ آپ نے خاص طور پر ان واقعات کا انتخاب کیا جو دلّی قدیم ثقافت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ "ہولی" کا تہوار قدیم دلّی کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ شاہد احمد نے "اُستاد بندو خان" کے خاکے میں ہولی کی ایک تقریب کا احوال بیان کیا ہے جس میں بڑے بڑے فن کار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پھر ان کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> "مہاراجہ اندور کے ہاں ہولی کے موقع پر گانے بجانے کا عظیم الشان جلسہ ہوتا تھا۔ سارے ہندوستان کے چیدہ فنکار جمع ہوتے تھے۔ بیس بیس پچیس پچیس ہزار کے انعام استادوں کو ملتے تھے۔ سنگیت سمراٹ استاد رجب علی خاں بڑا کڑوا گوّیا تھا۔ گھنٹوں دُرت گاتا تھا، اور ایک سے ایک نئی لاتا تھا۔ ایک ہولی میں جب رجب علی خاں گانے بیٹھے تو ان کے ساتھ سارنگی بجانے کے لیے مہاراج نے بندو کو بٹھا دیا۔ دونوں کی چڑھتی جوانی، ریاض بنے ہوئے۔ گویئے کو یہ زعم کہ گلے کا ساتھ بھلا ہاتھ کیا کرے گا۔ اور سارنگی نواز اس ترنگ میں کہ تمھارا سارا علم میرے ناخنوں میں ہے۔ جو گانا بجانا شروع ہوا ہے تو نہ وہ ہٹتا ہے نہ یہ اور تانیں وہ بن بن کر آ رہی ہیں کہ ساری محفل پھڑک جا رہی ہے۔ ہاتھ گلے کا ساتھ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو جیسا اس دن ہوا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دونوں ایسے گُتھے ہوئے تھے جیسے بلبلوں کی پالی ہو رہی ہو۔ نو گھنٹے تک یہ پکڑ جاری رہی۔ کانٹے کی کُشتی ہو رہی تھی مگر آر ہوتی تھی نہ پار۔ آخر مہاراج نے دونوں کو انعام دے کر چھُڑایا۔"(۸۶)

خاکے کی تشکیل میں واقعات کی اپنی اہمیت ہے لیکن اگر واقعات کی بہتات ہو گی تو بھی خاکے کی صحت پر بُرے اثرات مُرتب ہوں گے۔ شاہد احمد اس ضمن میں بہت محتاط نظر آتے ہیں۔ آپ نے صرف اور صرف ان واقعات کو بیان کیا ہے جو شخصیت کے چھُپے گوشوں کو سامنے لانے کے لیے ضروری تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے واقعات کے انتخاب اور پھر ربط و تسلسل کے ساتھ سے ان کے بیان میں جو مہارت دکھائی ہے وہ دوسرے خاکہ نگاروں کے کم کم نظر آتی ہے۔ شاہد احمد کا واقعات کو بیان کرنے کا اُسلوب بھی بہت ہی دل کش ہے جو قاری کی دل چسپی کو بڑھاتا ہے۔ ایک مصور لکیروں کی مدد سے شخصیت کے خط وخال کو اُبھارتا ہے جبکہ ایک

خاکہ نگار لفظوں اور واقعات کی بدولت شخصیت کے ظاہر و باطن کو قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنی تیز قوتِ مشاہدہ اور غیر جانب دار روّیہ سے واقعات کی جانچ پر کھ کر کے شخصیات کی مرقع نگاری کی اور کسی بھی اہم واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ آپ کے خاکوں کو پڑھتے ہوئے دل و دماغ مسرت محسوس کرتا ہے۔ ایک خاکہ نگار کی حیثیت شاہد احمد دہلوی نے ممدوح شخصیات کو انسان کی نظر سے دیکھا اور بیان کیا۔

ج۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا فنی تقابل:

اشتراکات

مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر میں ۱۵ شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ آپ کی خاکہ نگاری کا محرک ہم عصر شخصیات کی موت معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے ان شخصیات کی زندگی میں ان پر قلم نہیں اُٹھایا کیونکہ عام دستور یہی رہا ہے کہ جب تک کوئی زندہ رہتا ہے اُس کی وہ قدر نہیں کی جاتی جو مرنے کے بعد ہوتی ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کے متعلق یہ قیاس آرائی قطعاً درست معلوم نہیں ہوتی۔ جب تک آپ کے معاصرین زندہ رہے آپ کو اُن کی کمی محسوس نہ ہوئی اور جیسے ہی اُنہوں نے اس جانِ فانی سے کُوچ کیا آپ کو اُن کی یاد ستانے لگی۔ اس کمی اور یاد کے احساس کے مدوا کے لیے مولوی عبدالحق نے اپنی ہم عصر شخصیات کی لفظی تصاویر بنائی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے خاکوں میں ان عظیم شخصیات کے کارناموں کو مفصّل بیان کیا ہے۔ آپ نے اس بیان سے ان شخصیات کی یاد کو تازہ کیا اور اپنے لیے قلبی سکون کا بندوبست بھی کیا۔

شاہد احمد دہلوی کی گنجینہ گوہر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ شاہد احمد کی خاکہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان بہت اہمیت کا حامل ہے جس کے مطابق شاہد احمد دہلوی نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء کے دوران جتنے بھی خاکے تحریر کیے وہ اُن کی تحریک کا نتیجہ تھے۔ "گنجینہ گوہر" کے مقدمے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> "ان تمام لوگوں کے حالات قلم بند کر دیں۔ میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گئے۔ کہنے لگے، میں ان ناموں کی فہرست مرتب کر لیتا ہوں۔۔۔ فہرست بنانے بیٹھے تو بنتی چلی گئی۔۔۔ مکمل ہونے پر نہ آئی۔۔۔ تھک گئے۔۔۔ نام گنے، معلوم ہوا تین سو بہتر نام ہیں۔"(۸۷)

شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا مقصد تاریخی معلومات اور روایات کو محفوظ بنانا تھا۔ آپ جن چیدہ چیدہ علمی شخصیات سے ملے ان کی شخصیت، کردار، ان کی زبان، رہن سہن، بات چیت کے انداز، ماحول غرض ہر پہلو کا

احاطہ کیا۔ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا سلسلہ ۱۹۶۲ء تک جاری رہا۔ دونوں خاکہ نگاروں نے خاکہ نگاری کے فنی لوازم کا خوب خیال رکھا۔ یہاں دونوں کے خاکوں میں پائے جانے ولے فنی اشتراکات کا جائزہ لیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے ہاں جو پہلی قدر مشترک نظر آتی ہے وہ دونوں کا اختصار ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے واقعات کا مختصر اًبیان کیا ہے۔ غیر ضروری طوالت کا عنصر دونوں کے ہاں کم ملتا ہے۔ چند جملوں میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کا فن دونوں خاکہ نگاروں کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے چراغ علی کے خاکے میں ان کی علمی فضیلت کو یوں بیان کیا ہے:

"لگاتار محنت اور مطالعہ کی بدولت انھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبانِ دستارِ فضیلت کو میّسر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے نوجوانانِ ملک کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیں گے۔"(۸۸)

شاہد احمد دہلوی نے استاد بیخودؔ دہلوی کی علمی تشنگی کو کچھ ایسے ہی مختصر انداز سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"بیخودؔ کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وصی نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سارے ناول ہی چٹا دیے۔ مگر بیخودؔ صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "میاں اس میں مزا نہیں آیا۔ کوئی اور دو۔"(۸۹)

واقعات کی روانی، تسلسل اور توازن دونوں خاکہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ شخصیات کے متعلق جتنے بھی واقعات دونوں نے بیان کیے ہیں ان میں کوئی بھی غیر اہم محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ واقعات میں توازن اور تسلسل کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔ تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ واقعات کے بیان میں ذاتی پسند اور ناپسند کا عنصر بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مولوی عبدالحق کے پروفیسر حیرت مرزا، خواجہ غلام الثقلین اور مولانا وحیدالدین کے خاکے اور شاہد احمد دہلوی کے میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی اور استاد بیخودؔ کے روانی، تسلسل اور توازن کی بہترین مثالیں ہیں۔ مذکورہ خاکوں میں شخصیات کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مولانا وحیدالدین کی شخصیت کا ایک رُخ ملاحظہ فرمائیں۔

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت

میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتے تھے مگر بڑے سادہ طبعیت کے آدمی تھے، مصلحت ،سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا، جو جی میں آتا، کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محلِ وقوع ہے کہ بھی نہیں۔ یہی وجہ کہ جو لوگ ان کی طبعیت سے واقف نہ تھے، ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبر دست اخبار نویس ہونے کے سیاست کا ذوق نہ تھا اسی طرح باوجود زبر دست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے، یہ ذوقی چیز ہے اسے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔"(۹۰)

شاہد احمد دہلوی میر ناصر علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"میر ناصر کا تعلق چونکہ انگریز افسروں سے رہتا تھا اس لیے انہی کو خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔اُن کی یہ کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ جو بھی انگریز دکھائی دیتا اُسے سلام کر لیتے تھے کہ "کیا خبر کوئی بڑا افسر ہو یا کل کو یہی کوئی بڑا افسر بن کر آ جائے۔ فلاں صاحب کو دیکھو نا، پہلے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ادنیٰ افسر تھے، پھر محکمہ نمک میں کمشنر بن گئے، اور اب دلّی کے چیف کمشنر بن کر آ گئے ہیں ۔"(۹۱)

مذکورہ بالا واقعات میں دونوں خاکہ نگاروں نے ممدوح شخصیات کو اُجاگر کیا ہے جس سے ان شخصیات کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے واقعات کو ایک خاص ترتیب سے بیان کرتے ہیں ۔واقعات باہم مربوط ہیں۔ قاری کا ربط کہیں بھی نہیں ٹوٹتا اور وہ بے مزہ نہیں ہوتا۔ "چند ہم عصر" اور "گنجینہ گوہر" کے کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں خاکہ نگار اپنی خاکہ نگاری کے ذریعے روایات، دیدہ وشنیدہ باتوں اور معلومات کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں شخصیات سے جُڑی تمام معلومات کو بے باکی سے بیان کیا ہے۔

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے اپنے خاکوں میں وحدتِ تاثر کے عنصر کو بھی خوب نبھایا ہے۔ دونوں نے جو تاثر ابتداء میں پیدا کیا اُس کو آخر تک قائم رکھا۔ خاکہ چونکہ تاثرات اور مشاہدات سے ہی سے تشکیل پاتا ہے اور جو تاثر خاکہ نگار، صاحبِ خاکہ کے بارے میں قائم کرتا ہے وہی تاثر وہ قاری تک پہنچاتا ہے۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے ایسے واقعات اور انکشافات کی مدد سے خاکے لکھے ہیں جو آخر تک

ایک ہی تاثر کو قائم رکھتے ہیں۔

ایک خاکہ نگار کو چاہیے کہ وہ شخصیات کے متعلق تمام حقائق کو پوری غیر جانب داری سے قاری کے سامنے رکھے۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کی خاکہ نگاری میں یہ قدر بھی مشترک نظر آتی ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے ممدوح شخصیات کو جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کر دیا۔ دونوں خاکہ نگاروں نے خوبیوں ،خامیوں، کامیابیوں، ناکامیوں، دوستیوں اور دشمنیوں کو اپنے تبصرے اور تجزیے کے بغیر قاری کے سامنے رکھا۔ دونوں خاکہ نگاروں شخصیات کو صاف، واضح اور فطری انداز سے پیش کیا۔ قاری کسی بھی خاکہ کو پڑھتے ہوئے اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے شخصیات کے بیان کو پھیلا کر اُن کی تصویر کو دُھندلا نہیں کیا۔ بیان کردہ شخصیات چلتی پھرتی تصاویر ہیں جو قاری کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔

ایک خاکہ نگار کو خاکہ لکھنے کے لیے جو مواد درکار ہوتا ہے اس کے حصول کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں۔ مثلاً خاکہ ذاتی معلومات، شخصیات کے خطوط، شاعری، اقوال اور تصانیف وغیرہ سے مواد حاصل کر کے لکھا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کے لیے مواد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ خاکہ نگار کی ذاتی معلومات ہی ہیں۔ اس ضمن میں بھی مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ آپ دونوں نے جن شخصیات کے لکھے ان کے بارے میں آپ ذاتی معلومات رکھتے تھے۔ آپ کا ان لوگوں سے ذاتی تعلق تھا۔ آپ دونوں نے ذاتی معلومات کی بنا پر خاکہ نگاری کی۔ دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والا مواد خاکے کی تازگی کو متاثر کرتا ہے۔ براہ راست تعلق کی بنیاد پر حاصل ہونے والے مواد پر کسی شک وشُبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد نے دوسرے ذرائع پر بہت کم انحصار کیا ہے اور ذاتی معلومات ومشاہدات کی بنیاد پر ممدوح شخصیات کی لفظی تصاویر بنائی ہیں۔

کردار نگاری خاکے کا بنیادی جزو ہے۔ دونوں خاکہ نگار کے ہاں مشترک قدر یہ ہے کہ دونوں کرداروں کے ارتقائی مراحل کو بیان نہیں کیا۔ دونوں خاکہ نگاروں نے جن شخصیات کی مُرقع نگاری کی ہے وہ ارتقائی مراحل کو طے کر کے ایک خاص سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ دونوں خاکہ نگاروں نے شخصیات کے خدوخال، حرکات وسکنات، نفسیاتی اور ذہنی کیفیات و تغیرات کو کمال فن کاری سے متحرک کیا اور پڑھنے والا ان کو ایک مدت تک بُھلا نہیں پائے گا۔

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کی ایک اور مشترک قدر ان کا بیانیہ اُسلوب ہے۔ دونوں یکے بعد دیگرے ایک خاص ترتیب سے واقعات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں خاکہ نگار

واقعے، مشاہدے اور مطالعے کو ایک کہانی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ جہاں بھی قصّہ یا واقعہ کا عمل دخل ہوتا ہے وہاں بیانیہ اُسلوب کی کار فرمائی ضرور نظر آتی ہے۔ چونکہ خاکہ کی تشکیل واقعات کے بغیر ممکن نہیں اس لیے خاکہ میں بیانیہ اُسلوب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بیانیہ اُسلوب ٹھوس واقعیت اور ذہنیت کا مطالعہ کرتا ہے۔ دراصل بیانیہ اُسلوب غیر افسانوی ادب کی روح ہے کیونکہ اس میں کہیں نہ کہیں واقعہ یا قصّہ ضرور موجود ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے کچھ خاکوں توصیفی بیان معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے مولوی چراغ علی، حکیم امتیازالدین، وحیدالدین سلیمؔ اور حالی پر جبکہ شاہد احمد دہلوی کے ایم-اسلم اور جمیل جالبی پر لکھے گئے خاکے ان شخصیات کی توصیف و تعریف سے بھرپور ہیں۔ ان خاکوں میں دونوں خاکہ نگاروں نے ممدوح شخصیات کے مشاغل اور مصروفیات کو بیان کو بیان کرتے ہوئے ان کی وضع داری اور شرافت کو نمایاں کیا ہے۔

کسی بھی ادبی صنف میں اُسلوب کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ اُسلوب سے ادیب یا شاعر اپنی تخلیق میں ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ ایک خاکہ نگار اپنے اُسلوب کی بدولت ہی کسی شخصیت کو ایک خاص رنگ میں ڈھالتا ہے اور قاری کی دل چسپی کو قائم رکھتا ہے۔ اُسلوب میں اس کی روانی اور تسلسل کی بہت اہمیت ہے۔ یہ روانی اور تسلسل مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے ہاں موجود ہے۔ دونوں کی زبان صاف ستھری اور سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کو سے عبارت کا سجایا گیا ہے۔ تشبیہ اور استعاروں کا استعمال بہت کم ہے اس کے باوجود عبارت میں صفائی اور چُستی کی وجہ سے تاثیر اور پختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں کے اُسلوب میں ایک خاص متانت اور سنجیدگی ہے۔

خاکوں میں تکنیک کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ خاکہ نگار مختلف تکنیکوں کی مدد سے خاکے کو پُر اثر بناتے ہیں۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دونوں نے ہی بیانیہ اور واقعاتی تکنیک کو استعمال میں لایا ہے۔ مولوی عبدالحق نے پروفیسر حیرت مرزا، مولوی عُزیر مرزا، ڈاکٹر مولوی سیّد علی، محسن الملک اور شاہد احمد دہلوی نے مولانا عنایت اللہ، مولوی نذیر احمد، بشیر الدین احمد، حکیم کیف دہلوی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خاکوں اس تکنیک کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی نے جن شخصیات کی خاکہ نگاری کی ہے ان کا تعلق علم و ادب سے ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں نے علم و ادب کے تناظر میں ایک عہد کی تاریخ مرتب کی ہے۔ دونوں خاکہ نگاروں

نے شخصیات کے کارناموں اور سوانحی حالات کو تفصیل سے قارئین کے سامنے رکھا ہے۔

افتراقات

فنی اعتبار سے مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری میں اشتراکات کے ساتھ کچھ افتراقات بھی ملتے ہیں۔ "گنجینہ گوہر" اور "چند ہم عصر" کے خاکوں میں پائے جانے والے افتراقات درج ذیل ہیں:

مولوی عبدالحق نے جن لوگوں پر قلم اُٹھایا ہے اُن میں مشاہیر کے ساتھ ساتھ معمولی اور عام ہستیاں بھی شامل ہیں جو مشاہیر کی طرح راست بازی، جفاکشی، وضع داری اور انسان دوستی کی بہترین مثالیں ہیں۔ گدڑی کا لال۔ نور خان اور نام دیو کے خاکے اس کی مثالیں ہیں۔ جبکہ شاہد احمد دہلوی نے جن لوگوں کی خاکہ نگاری کی ہے وہ سب کے سب علم وادب سے وابستہ ہیں سوائے اُستاد بندو خان کے، اُن کو بھی شاہد احمد نے قارئین کے سامنے اپنے فن کے ایک ماہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ بندو خان بھی کوئی عام شخص نہیں تھا۔ منظر نگاری کے حوالے میں شاہد احمد دہلوی مولوی عبدالحق سے آگے نظر آتے ہیں۔ واقعات کو بیان کرتے ہوئے شاہد احمد حالات وکیفیات کی عکاسی یوں کرتے ہے کہ پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ میر ناصر علی کے خاکے میں ان کی حویلی کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

> "میر صاحب کی حویلی ----حویلی کاہے کو محل سرا کہنا چاہیے----کے تین حصّے تھے۔ زنانہ جس میں کُشادی دالان در دالان، مغل محرابوں والے، ان میں پٹاپٹی کے روئی بھرے دبیز پردے پڑے ہوئے۔ دالانوں میں دائیں بائیں کوٹھڑیاں تھیں۔ پیش دالان کے آگے صحن چبوترہ۔ اس کے پہلوؤں میں منچیاں۔ نیچے کے رُخ دائیں جانب ایک سہ دری تھی۔"(۹۲)

شاہد احمد کا مشاہدہ بہت گہرا اور تیز ہے۔ آپ کے ہاں فرد اور منظر میں ہم آہنگی ملتی ہے۔ آپ منظر کو پسِ منظر کی روح تک بیان کرنے کے عادی ہیں۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں واقعات نگاری تو کثرت سے ملتی ہے مگر منظر نگاری بہت ہی کم کم ہے۔

خاکہ نگاری کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس "میں" کی تکرار کم سے کم ہو۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں "میں" کی تکرار نہیں ہے۔ آپ نے اپنے مشاہدات کو انتہائی مہارت سے الفاظ میں ڈھال کر قاری کو وہ تاثر دینے کی سعی کی ہے جو ان کا مقصد و مدعا تھا۔ لیکن شاہد احمد کے ہاں "میں" کی تکرار کثرت سے

ملتی ہے۔ جمیل جالبی، میر آجی اور خصوصاً شاہد احمد دہلوی کا اپنے بارے میں لکھا ہوا خاکہ، ایسے خاکے ہیں جو "میں میں" کی تکرار کے واضح عکاس ہیں۔

مولوی عبدالحق نے جن شخصیات کو بیان کیا ہے ان کی اچھائیوں اور خامیوں کو متوازن اور غیر جاندارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ نفسیاتی طور پر انسان وہی خوبیاں اور اقدار دوسرے لوگوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے جو بذاتِ خود اس کے اپنے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ایسی خوبیاں اور اقدار اس کو زیادہ متاثر کرتی ہیں اور وہ معترف بھی ان ہی کا ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کے مقابلے میں شاہد احمد نے شخصیات کی خوبیوں اور اقدار کو عقیدت کے تناظر میں نہیں دیکھا۔ اس ضمن میں شاہد احمد نے معروضیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ آپ نے عیب کو عیب اور خوبی کو خوبی بیان کیا ہے۔ میر آجی، منٹو اور جوش کے خاکوں میں آپ کی معروضیت کی جھلکیاں نمایاں ہے۔

سراپا نگاری کے حوالے سے دہلوی صاحب کے خاکے مولوی صاحب سے بہت آگے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صرف مولوی چراغ کے خاکے میں اُن کے سراپے کو مختصراً بیان کیا ہے۔ باقی کے خاکوں میں آپ نے شخصی اوصاف کو بیان کر کے شخصیت کا پَرتو قاری کے دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کے خاکوں میں باقاعدہ سراپا نگاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں سراپا نگاری کے باقاعدہ نمونے ملتے ہیں۔ حلیہ نگاری میں شاہد احمد بہت ماہر تھے۔ آپ کا بیان کردہ حلیہ کسی دوسرے حلیہ سے بالکل نہیں ملتا تھا۔ "گنجینہ گوہر" میں شاہد احمد دہلوی کی سراپا نگاری کو بطور نمونہ باعث تقلید ہے۔

اسلوب کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں سادگی اور سلاست کا عنصر نمایاں ہے۔ آپ کے اُسلوب کی سنجیدگی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اسلوب شگفتہ اور شیریں ہے۔ تشبیہات اور محاورات کا استعمال برجستہ ہے۔ آپ کے لب ولہجہ کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی انشاء پردازی کی بہترین مثال ہے۔ مولوی عبدالحق کے مقابلے میں شاہد احمد کا اُسلوب مختلف نوعیت کا ہے۔ شاہد احمد نے دلّی کی ٹکسالی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ٹھیٹھ لفظوں کے استعمال نے شاہد احمد کے خاکوں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ گنجینہ گوہر میں ان ٹھیٹھ الفاظ کی ایک جھلک جگہ جگہ ملتی ہے مثلاً میر ناصر علی کے خاکے میں دیکھیے "کبھی کبھی اُن پر زڑ بھی سوار ہو جاتی تھی"(۹۳) س جملہ میں شاہد احمد نے ایک بوڑھے شخص کی غصّے کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ بچے کے لیے تو ضد کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن آپ نے کمال خوب صورتی سے زڑ" کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔ محاورات کے استعمال میں بھی شاہد احمد دہلوی مولوی صاحب سے الگ ہی نظر آتے ہیں۔ بشیر الدین احمد

کے خاکے میں مسجد کے مُلّا کے روّیے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ "جب اُس کا ناریل چٹختا تو بچوں کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتا"(۹۴) شاہد احمد نے مولوی عبدالحق کے مقابلے میں زیادہ فصیح اور بلیغ زبان کو استعمال کرتے ہیں۔

شاہد دہلوی نے اپنے اُسلوب کی وجی سے ہی خاکے میں شروع سے آخر تک دل چسپی اور شگفتگی کے احساس کو برقرار رکھتے ہیں جبکہ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری میں سنجیدگی ہی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ شاہد احمد کے خاکوں میں تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کیا گیا ہے جبکہ مولوی عبدالحق نے جن لوگوں کی مُرقع نگاری کی ہے ان کی علمی، ادبی خدمات اور عادات وخصائل کو تو بہت جامع انداز سے بیان کیا گیا ہے لیکن تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بہت کم ملتی ہیں۔ شاہد احمد نے مولوی نذیر احمد کے خاکے میں دلّی کے لوگوں کے رہن سہن، مکانوں کی بناوٹ اور تزہین و آرائش کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ میر ناصر علی، اُستاد بیخودؔ، مولوی بشیر الدین احمد، عظیم بیگ چغتائی، میر آجی اور منٹو کے خاکوں میں آپ نے دلّی کے سماج اور ثقافت کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔

خاکے کی تمہید یا ابتداء کے حوالے سے بھی دونوں خاکہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جن ہم عصر شخصیات کے خاکے لکھے ہیں وہ اس جانِ فانی سے کُوچ کر چکی تھیں۔ آپ نے انکی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ان کی خاکہ نگاری کی۔ مولوی صاحب اپنے خاکوں کی ابتداء تعریف و توصیف سے کرتے ہیں اور صاحبِ خاکہ کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے قاری سے اس کا تعارف کرواتے ہیں۔ کبھی کبھار آپ خاکے کے شروع میں موت کا ذکر کر کے قاری کے جذبات کو اُبھارتے ہیں لیکن شاہد احمد دہلوی خاکے کی ابتداء میں کوئی اہم واقعہ بیان کرتے ہیں اور پھر اُس اہم واقعہ سے شخصیت کو جوڑ کر بیان کرتے ہیں۔ چند ایک خاکوں کی ابتداء میں صاحبِ خاکہ کے سراپے کو بیان کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری مذہبی عنصر کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ آپ نے مختلف خاکوں میں شخصیات کے مذہبی عقائد اور مذہب سے جُڑے واقعات کو بیان کیا ہے جبکہ شاہد احمد کے ہاں مذہب کا بیان سرسری نوعیت کا ہے۔

مولوی صاحب کی خاکہ نگاری میں شخصیات سے اُن کی عقیدت جھلکتی ہے۔ آپ نے طنز و تمسخر کو اپنے خاکوں میں بہت کم جگہ دی ہے۔ خاکے میں طنز و تمسخر سے ہجو کی بنیاد پڑتی ہے اور شخصیت کی تنقیص کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ خاکہ نگاری دراصل شخصیت کو دوبارہ سے دریافت کا عمل ہے۔ اگر اس دریافت میں خاکہ نگار سنجیدگی سے کام نہیں لے گا تو وہ موضوع سے بہت دور نکل جائے گا۔ مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری میں

عقیدت اور سنجیدگی کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے ہاں عقیدت کا عنصر اتنی شد و مد سے موجود نہیں ہے۔ آپ نے واقعات کے ڈھیر سے ایسے واقعات کو چُنا جو مُرقع نگاری کے لیے زیادہ اہم تھے اور پھر ان کو ایک خاص ترتیب سے بیان کر دیا۔ شاہد احمد دہلوی صاحبِ خاکہ کی ہر ادا، خصوصیت اور عادت کو واقعاتی انداز سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ طنز و تمسخر کے تیر بھی چلاتے ہیں، شرارتوں کو بھی بیان کرتے ہیں، دوستوں سے ہنسی مذاق اور بے تکلفی کو بھی بیان کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی شاہد احمد کی خاکہ نگاری میں عقیدت کا عنصر نہیں ملتا۔

حوالہ جات

۱۔ صابرہ سعید، ،اردو ادب میں خاکہ نگاری، ،ص ۴۲

۲۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ۱۹۸۶، ص ۸۔۹

۳۔ عبد الحق، ،چند ہم عصر،، ص ۹

۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۵۔ ایضاً، ص ۶۵

۶۔ ایضاً، ص ۹۷

۷۔ ایضاً، ص ۹۸

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۱۱۔ صابرہ سعید ،اردو ادب میں خاکہ نگاری ،ص ۴۸

۱۲۔ عبد الحق، چند ہم عصر، ص ۲۰

۱۳۔ ایضاً، ۴۸۔۴۹

۱۴۔ ایضاً، ۵۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۱۸۔ معین الدین، سیّد، ڈاکٹر، بابائے اردو (احوال وافکار)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۹۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۰۔ عبد الحق ،چند ہم عصر، ص ۱۱۹

۲۱۔ ایضاً ،ص ۱۴۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۵۔ ایضاً، ص۹۶

۲۶۔ ایضاً، ص۲۷۔۲۸

۲۷۔ ایضاً، ص۹۸

۲۸۔ ایضاً، ص۱۷

۲۹۔ ایضاً، ص۷۹

۳۰۔ ایضاً، ص۹۳

۳۱۔ ایضاً، ص۱۰۵

۳۲۔ ایضاً، ص۱۰۶

۳۳۔ ایضاً، ص۱۱۳

۳۴۔ ایضاً، ص۱۱۵

۳۵۔ ایضاً، ص۱۲۶

۳۶۔ ایضاً، ص۱۳۶

۳۷۔ ایضاً، ص۱۴۰

۳۸۔ ایضاً، ص۱۴۲

۳۹۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی اردو ادب، لاہور، ۱۹۶۴، ص۶۶۱

۴۰۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۲۵۔۲۶

۴۱۔ ایضاً، ص۔۶۹۔۷۰

۴۲۔ ایضاً، ص۸۴۔۸۵

۴۳۔ ایضاً، ص۹۹

۴۴۔ ایضاً، ص۱۱۲

۴۵۔ ایضاً، ص۱۳۴

۴۶۔ ایضاً، ص۱۶۸

۴۷۔ ایضاً، ص۱۷۳

۴۸۔ ایضاً، ص۳۰

۴۹۔ یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، ص۴۵

۵۰۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۶۵

۵۱۔ ایضاً، ص۸۷

۵۲۔ ایضاً، ص۵۵

۵۳۔ ایضاً، ص۱۵۵

۵۴۔ ایضاً، ص۱۸۹

۵۵۔ ایضاً، ص۱۱۶

۵۶۔ ایضاً، ص۲۳۴

۵۷۔ حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، ص۲۱۲

۵۸۔ عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، ص۶۶۱

۵۹۔ الطاف فاطمہ، تاریخ ادبیات۔۔۔(دسویں جلد) اردو ادب پنجم، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ص۲۱۵

۶۰۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۶۳

۶۱۔ یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، ص۵۳

۶۲۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۱۲۷

۶۳۔ محمد عارف، سید، ڈاکٹر، شاہد احمد دہلوی، حالات و آثار، احمد گرافکس، کراچی، ۲۰۱۸، ص۱۱۴

۶۴۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۱۱۸

۶۵۔ ایضاً، ص۲۱۱

۶۶۔ ایضاً، ص۱۳۰

۶۷۔ ایضاً، ص۸۳

۶۸۔ ایضاً، ص۱۶۹

۶۹۔ ایضاً، ص۱۷۰

۷۰۔ ایضاً، ص۱۵۷۔۱۵۸

۷۱۔ ایضاً، ص۱۸۵

۷۲۔ ایضاً، ص۱۱۹

۷۳۔ ایضاً، ص۱۸۸

۷۴۔ ایضاً، ص۱۱۰

۷۵۔ محمد عارف،، شاہد احمد دہلوی حالات و آثار، ص۱۶۱

۷۶۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۱۵۳

۷۷۔ ایضاً، ص۸۸

۷۸۔ ایضاً، ص۷۳۔۷۴

۷۹۔ ایضاً، ص۹۳

۸۰۔ ایضاً، ۱۶۴۔۱۶۵

۸۱۔ ایضاً، ص۱۴۰

۸۲۔ ایضاً، ص۱۱۳

۸۳۔ ایضاً، ص۱۴۸

۸۴۔ ایضاً، ص۱۷۴

۸۵۔ ایضاً، ص۲۴۶۔۴۷

۸۶۔ ایضاً، ص۱۸۴

۸۷۔ محمد عارف، شاہد احمد دہلوی حالات و آثار، ص۱۷۰

۸۸۔ عبدالحق، ،چند ہم عصر، ص۳۱

۸۹۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۵۰

۹۰۔ عبدالحق، ،چند ہم عصر، ص۹۹

۹۱۔ شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، ص۳۷

۹۲۔ ایضاً، ص۳۳

۹۳۔ ایضاً، ص۳۸

۹۴۔ ایضاً، ص۸۱

باب چہارم:

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

مجموعی جائزہ

نثری ادب کی غیر افسانوی اصناف میں خاکہ نگاری کی صنف کا اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ یہ صنف زیادہ قدیم نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کے نقوش محمد حسین آزادؔ کی "آب حیات" میں ملتے ہیں۔اس کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اس اعتبار سے یہ صنف ایک نوخیز صنفِ ادب ہے جس کی ابتداء اردو ادباء کے سر ہے۔ ابتداء میں اردو زبان میں خاکہ نگاری کے فنی اصول اور ضوابط متعین نہ تھے یوں مختلف ادیبوں نے اس صنفِ ادب کو اپنے اپنے انداز میں برتا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف میں نکھار آتا گیا اور جب اس غیر افسانوی ادب کا ایک گراں قدر ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تو نقادین نے اس فن کے کچھ اصول و ضوابط متعین کیے۔ خاکہ نگاری کا دیگر اصنافِ ادب جیسے ناول، افسانہ،ڈرامہ، سوانح عمری، انشائیہ اور مکتوب نگاری سے بھی گہرا تعلق ہے۔ بغور مطالعہ سے خاکہ نگاری کے نمونے آسانی سے مذکورہ اصناف میں مل جاتے ہیں۔ خاکہ دراصل کسی بھی شخصیت کے معروضی مطالعہ کا نام ہے۔اس مطالعہ میں خاکہ نگار کی قوتِ مشاہدہ اور فہم وادراک کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ خاکہ میں خاکہ نگار کی غیر جانب داری اور اُسلوب کی بھی اپنی اہمیت ہے کیونکہ ایک خاکہ نگار اپنی غیر جانب داری اور اُسلوب کی طاقت سے کسی شخصیت کے منفرد اور اہم پہلو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ افکار و نظریات کی جھلکیاں بھی دکھاتا ہے اور خوبیوں اور خامیوں کو ایک توازن سے یوں بیان کرتا ہے کہ صاحبِ خاکہ سے نفرت نہیں ہوتی۔ خاکہ نگار شخصیت کو نہ تو اتنا مختصر بیان کرتا ہے کہ پوری شخصیت کا احاطہ نہ ہو سکے اور نہ ہی اتنا طویل کرتا ہے کہ بھرتی کا تاثر اُبھرے۔ خاکہ مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا اس میں صرف اور صرف نمایاں خصوصیات کو قاری کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری میں مزاح اور نقطہ آفرینی کے عنصر کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ خاکہ شخصیت کا ایک سنجیدہ بیان ہے۔ جہاں خاکے میں سنجیدگی ہو گی وہاں دلچسپی اور تسلسل کو بھی قائم رکھا جائے گا۔

مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں جن شخصیات پر قلم اُٹھایا ہے ان کی سیرت کو ایک خاص تسلسل اور روانی سے بیان کیا ہے۔ آپ نے شخصیت کے بیان میں سیاست اور سماج کو واقعات کی مدد سے بیان

کیا ہے۔ آپ علی گڑھ کی تحریک سے متاثر تھے اس لیے آپ کی خاکہ نگاری میں علی گڑھ کی سیاسی و سماجی خدمات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ آپ نے انگریزوں کی علم دوستی، سماجی برائیوں جیسے رشوت اور اقرباء پروی کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے خاکوں میں سلطنتوں کے عروج و زوال، اردو ہندی تنازعہ اور اصلاحِ تمدن کے لیے کی جانے والی کوششوں کو بھی بطورِ خاص بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے سیاست اور سماج کے بھرپور بیان کے بعد اپنے معاصرین کی علمی اور ادبی خدمات کو بیان کرتے ہوئے ان تغیرات اور انقلابات کی بھی ایک جھلک قارئین کو دکھائی ہے جو علمی میدان میں رُونما ہوئے۔ آپ نے اپنے خاکوں کی مدد سے آنے والی نسلوں کو اپنے دور کے ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کروایا۔ سیاست، سماج اور علم وادب کے بعد مولوی عبدالحق نے اپنے لکھے گئے خاکوں میں شخصیات کے مذہبی رجحان، خیالات و نظریات اور مذہبی خدمات کو بھی بیان کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے جن واقعات کا انتخاب کیا وہ لائقِ تحسین ہیں۔ آپ نے واقعات کا انتخاب بڑی دانش مندی سے کیا۔ قاری کسی بھی واقعے کو پڑھنے کے بعد آپ کے کسی خاص فرقے کی طرف جھکاؤ کو محسوس نہیں کرتا۔ خاکوں میں مذہبی واقعات کے چناؤ سے آپ کی مذہبی رواداری عیاں ہوتی ہے۔ آپ نے جن شخصیات کو بیان کیا ان کے خیالات متشدد نہ تھے اور نہ ہی وہ فرقہ بندی کے قائل نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر مولوی عبدالحق کے خاکوں میں سیاست، سماج، علم وادب اور مذہب کا بھرپور بیان ملتا ہے۔

فنی اعتبار سے مولوی عبدالحق کے خاکے اختصار اور جامعیت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اختصار اور جامعیت کے عنصر کو آپ نے تقریباً ہر خاکے میں ملحوظ رکھا۔ آپ کے خاکوں کو پڑھنے کے بعد قاری تشنگی محسوس نہیں کرتا۔ مولوی صاحب کے خاکوں میں حلیہ نگاری کی مثالیں بہت کم ہیں۔ صرف مولوی چراغ کے خاکے میں دو یا تین لائنوں میں اُن کے سراپا کو بیان کیا گیا ہے۔ باقی کے خاکوں میں شخصی اوصاف کا بیان کثرت سے ہے۔ شاید مولوی عبدالحق شخصی اوصاف سے ہی ممدوح شخصیات کی ایک صورت بنا کر قاری کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اُسلوب کے حوالے سے مولوی صاحب کے خاکوں میں محاورات اور دقیق الفاظ کا استعمال بہت کم ہے۔ آپ کی زبان سادہ وعام فہم ہے۔ آپ کے ہاں اُسلوب کی سادگی اور سلاست بھی ہے۔ مولوی عبدالحق کے اُسلوب میں ہمدردی کا عنصر بھی موجود ہے۔ آپ کے ہاں عربی اور فارسی کا استعمال بہت ہی کم ہے۔ آپ کی عبارت میں جھول نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے شخصیات کے معائب و محاسن کو غیر جانب داری سے بیان کیا ہے۔ آپ کی خاکہ نگاری میں عقیدت کا عنصر بھی موجود ہے۔ آپ نے اپنے خاکوں

میں رسمی باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی بے باک نگاری کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک معمولی مالی سے لے کر حالی جیسی عظیم شخصیت کے خاکے لکھے۔ آپ عظمت، شہرت، وقار اور شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ آپ کا معیار انسانیت تھا۔ آپ نے انسان سے زیادہ اُس کے کام کی ستائش کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی اسی فکر نے آپ سے نام دیو اور نور خان جیسے خاکے لکھوائے۔ ان دونوں کرداروں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سب کچھ کر گزرتے تھے۔ ان کی یہی خوبی مولوی عبدالحق کو بھائی اور آپ نے ان کو اوراق کی زینت بنا کر امر کر دیا۔ مولوی صاحب نے نام دیو اور نور خاں کے جذبہ خدمت کو اس پُر سوز انداز سے بیان کیا۔ مولانا حالیؔ، محسن الملک، خواجہ غلام الثقلین، مولانا وحید الدین سلیمؔ کے خاکوں میں آپ نے ان کی نجی زندگی کے کچھ پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ مولوی عبدالحق کا انداز معروضی نوعیت کا ہے۔ کچھ خاکوں مولوی صاحب نے تنقیدی اور طنزیہ انداز بھی اپنایا ہے لیکن ان کا طنز تیکھا نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق نے متروک الفاظ اور محاورات سے عبارت میں دلکشی پیدا کی ہے۔ مجموعی طور پر "چند ہم عصر" خاکہ نگاری کی ایک عمدہ کتاب ہے جس میں کردار نگاری کی بہترین نمونے ملتے ہیں ۔مولوی عبدالحق کا معروضی انداز اور آپ کی ممدوح شخصیات سے ذاتی تعلق اور سماجی پسِ منظر کی بھرپور جھلکیاں "چند ہم عصر" کے خاکوں میں ملتی ہیں۔ "چند ہم عصر" میں لکھے گئے خاکوں کی بدولت مولوی عبدالحق اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کی خاکہ نگاری کا مقصد روایات،، تاریخی معلومات دید و شنید باتوں کو محفوظ کرنا تھا۔ آپ نے جن شخصیات کو جلوت اور خلوت میں دیکھا اُن شخصیات کے کردار، رہن سہن، اُٹھنے بیٹھنے کے انداز، ماحول اور بات چیت کے انداز کو اپنی خاکہ نگاری کے ذریعے سے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ شاہد احمد دلّی کی تہذیب و ثقافت سے بہت محبت تھی اسی محبت کی بدولت آپ نے اپنے خاکوں میں اس تہذیب و ثقافت کو بھرپور انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی مذہب، سماج، علم وادب اور سیاست کے واقعات کو اپنی خاکہ نگاری میں جگہ دی ہے۔ یہ سارے کے سارے واقعات آپ کی علمی وادبی، مذہبی، سیاسی و سماجی فکر کو قاری کے سامنے لانے میں مدد و معاون ہیں ۔ آپ نے معاشرتی مسائل کی نشاندہی کی ہے اور سیاسی و مذہبی معاملات کو بھی بیان کیا ہے۔ شاہد احمد نے مولوی نذیر احمد، میر ناصر علی، بشیر الدین احمد، مولوی عنایت اللہ، منٹوؔ اور جوشؔ کے خاکوں میں سماجی مسائل، قدیم ہندی ثقافت اور معاشرتی روّیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی صورتِ حال کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ نے دلّی کی

قدیم عمارات کی بناوٹ کو دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ آپ نے ادبی محافل ان کے انعقاد کے لیے کی جانے والی تیاریوں کو بھی خوب تفصیل سے قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ سماج کو بیان کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے ہندو مسلم دوستانہ تعلقات، شادی بیاہ کی تقریبات اور رسم ورواج کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ شاہد احمد نے حکمران طبقے کے مقامی لوگوں سے سلوک کو خاص طور پر بیان کیا ہے اور کچھ ایسے اقدامات کی نشاندہی بھی کی ہے جن سے مقامی لوگ ناخوش تھے۔ بیان کردہ تمام نکات شاہد احمد دہلوی کی سیاسی اور سماجی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔

شاہد احمد کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے تھا۔ اس وجہ سے ان کی فکر میں علم و ادب سے گہری وابستگی کوئی انہونی بات نہ تھی۔ آپ کے دادا اور والد کی علمی اور ادبی خدمات کسی سے ڈھکی چُھپی نہیں ہیں۔ شاہد صاحب کی پرورش ایک علمی اور ادبی گھرانے میں ہوئی۔ اس ماحول کی بدولت آپ کے ادبی ذوق کی نشو ونما ہوئی اور پھر یہی ادبی ذوق آپ کی خاکہ نگاری میں موجزن نظر آیا۔ شاہد احمد نے اُستاد بیخودؔ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، میر آجی، منٹو، مرزا محمد سعید اور اُستاد بندو خان کے خاکوں میں ان شخصیات کی علم وفن سے گہری وابستگی کو خصوصی طور پر بیان کیا۔ آپ نے ادبی محافل، علم وادب کی ترویج وترقی کے لیے کیے جانے والے اقدامات، اخبارات ورسائل اور کتابوں کے ذکر سے ان شخصیات کے کو زندہ وتابندہ کیا۔

شاہد احمد کے خاکوں میں مذہب کی جھلک بھی نظر آتی ہے کیونکہ انسان کا کسی مذہب سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ اگر خاکہ نگار شخصیت کے بیان میں مذہب کو نظر انداز کرے گا تو صاحبِ خاکہ کی تصویر دُھندلی رہے گی۔ شاہد احمد نے جن شخصیات کی خاکہ نگاری کی آپ ان کے مذہبی نقطہ نظر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ نے خاکہ نگاری میں مذہب کے ذکر کو شامل کرکے مذہب سے اپنی وابستگی دکھائی ہے۔ شاہد احمد نے جن شخصیات کو بیان کیا ہے ان کے مذہبی رجحان، خدمات، عبادات اور معاملات کو غیر جانب داری سے بیان کیا ہے۔ خاکہ جن فنی لوازم کا تقاضا کرتا ہے شاہد احمد نے اپنی خاکہ نگاری میں ان کا خوب اہتمام کیا ہے۔ چہرہ نویسی، شخصیت کی مرقع نگاری، منظر نگاری، واحد تاثر، اختصار، واقعہ نگاری سبھی لوازم ایک خاص توازن کے ساتھ شاہد احمد دہلوی کی خاکہ نگاری میں موجود ہیں۔ سب سے پہلے سراپا نگاری کو ہی دیکھ لیں۔ شاہد احمد صاحبِ خاکہ کے سراپا کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک ہجوم میں بھی اُس کو پہچاننا جا سکتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی سراپا نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ مختصر الفاظ میں سب جزئیات کو قاری کے روبرو رکھ دیتے ہیں۔ یوں اس کے دل ودماغ میں صاحبِ خاکہ کی مکمل تصویر بیٹھ جاتی ہے۔ میر ناصر علی، حسن نظامی، میر آجی، بے خودؔ

دہلوی، حکیم کیفؔ دہلوی، مرزا سعید، استاد بندو خان اور جمیل جالبی کے خاکوں میں آپ نے ان کے سراپے کو تمام تر جزئیات کے ساتھ قاری کے سامنے رکھا ہے۔

واقعہ نگاری میں شاہد احمد دہلوی کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ کسی بھی شخصیت کے متعلق واقعات کی ایک لمبی فہرست ایک خاکہ نگار کے سامنے ہوتی ہے۔ ان بے شمار واقعات میں سے ایسے واقعات کا چناؤ جن سے صاحبِ خاکہ کے تاثر کو اُبھارا جا سکے، کا انتخاب یقیناً جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن شاہد احمد دہلوی نے اس ضمن میں بھی کمال مہارت دکھائی ہے۔ آپ نے خاکوں میں صرف اور صرف ان واقعات کو جگہ دی ہے جن کا صاحبِ خاکہ سے اٹوٹ رشتہ تھا۔ واقعات کے انتخاب کے بعد ان واقعات کو ایک خاص توازن اور ترتیب سے پیش کرنا اگلا مرحلہ ہوتا ہے تاکہ قاری کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ شاہد احمد چھوٹے چھوٹے واقعات کا انتخاب کر کے ان واقعات کو توازن اور تسلسل سے پیش کرتے ہیں اور موضوعِ خاکہ کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔

اُسلوب کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی اس لیے باقی خاکہ نگاروں سے منفرد ہیں کہ آپ نے مشکل اور نامانوس الفاظ کو کم استعمال کیا ہے۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کا اُسلوب ہی قارئین کو ان کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی زبان ٹکسالی، سادہ اور شستہ ہے۔ محاورات شگفتہ اور فقرات بے تکلفی اور برجستگی سے بھرپور ہیں۔ آپ نے شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں کو ایک خاص سلیقے اور توازن سے بیان کیا ہے۔ کچھ شخصیات آپ تیکھے جملوں کی زد میں بھی آئیں۔ دراصل شگفتگی اور لطیف طنز آپ کے اُسلوب کی خوبی ہے۔ آپ نے کچھ واقعات کی مدد سے صاحبِ خاکہ سے ہمدردی کے جذبے کو اُبھارا ہے۔ آپ کے اُسلوب کی چاشنی قاری اور صاحبِ خاکہ کے درمیان تعلق کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔ آپ صاحب خاکہ کی اگر کوئی خامی بیان کرتے ہیں تو اگلے ہی لمحے ایسا واقعہ بیان کر دیتے ہیں کہ قاری موضوعِ خاکہ کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاہد احمد کے اُسلوب کی ایک اور نمایاں خوبی ان کی راست بازی بھی ہے۔ آپ نے مبالغہ آرائی سے مکمل اجتناب کیا ہے۔ آپ نے کسی کی شان میں نہ تو قصیدے پڑھے اور نہ ہی کسی کے درجے میں کمی آنے دی۔ شاہد احمد کے اُسلوب میں ہلکی پھلکی شوخی بھی جھلکتی ہے۔ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور بہت سادگی سے گہری بات کرتے ہیں۔ آپ ایسا انداز اپناتے ہیں کہ قاری کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ شاہد احمد نے شخصیات کی موت کو بھی منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ موضوعِ خاکہ کی اس دنیا سے رخصتی کی منظر نگاری اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری اپنی پسندیدہ شخصیت کے جدا ہونے پر زیادہ غمگین نہیں ہوتا۔ شاہد احمد

دہلوی کا اُسلوب ایسا ہے کہ ان کی عام بات بھی دل پر اثر کرتی ہے۔ آپ نے انگریزی اور عربی الفاظ کو کم سے کم استعمال کیا ہے۔ آپ کی خاکہ نگاری میں دلّی کی ٹکسالی زبان پوری شان سے موجود ہے۔

اگر اختصار کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کو جانچا جائے تو آپ نے بہت ہی کم الفاظ میں اپنا مطلب و مدعا بیان کیا ہے۔ غیر ضروری طوالت ایک خاکہ نگار کو اپنے مقصد سے دور لے جاتی ہے اس لیے شاہد احمد دہلوی نے اختصار کو ترجیح دی ہے اور زیادہ تفصیل سے گریز کیا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ شاہد احمد کے پاس شخصیات کے حوالے سے مواد کی کمی تھی بلکہ آپ کے پیشِ نظر خاکے کا اختصار تھا اور اسی وجہ سے آپ نے واقعات و معلومات کو مختصر مگر جامعیت سے بیان کیا۔ بحیثیت مجموعی شاہد احمد دہلوی نے "گنجینہ گوہر" کے خاکوں میں اپنی سوچ اور فکر کو بھرپور انداز سے پیش کیا اور اس پیش کش میں آپ نے خاکے کے تمام فنی لوازم کا حتی الوسع خیال بھی رکھا۔ شاہد احمد دہلوی نے "گنجینہ گوہر" میں جن شخصیات کی خاکہ نگاری کی ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا۔

ب۔ نتائج

مولوی عبد الحق کی "چند ہم عصر" اور شاہد احمد دہلوی کی "گنجینہ گوہر" کے فکری اور فنی تقابل کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

۱۔ مولوی عبد الحق اور شاہد احمد دہلوی نے "چند ہم عصر" اور "گنجینہ گوہر" کے خاکوں میں سماجی و سیاسی، علمی وادبی اور مذہبی واقعات بیان کیا ہے۔ یہ سارے واقعات ان دونوں خاکہ نگاروں کی فکر کو سامنے لاتے ہیں۔

۲۔ مولوی عبد الحق تحریکِ علی گڑھ سے وابستہ رہے تھے اور اس تحریک کی سیاسی اور علمی و ادبی کاوشیں کسی سے ڈھکی چُھپی نہیں اس لیے آپ کے خاکوں میں سیاست اور علم و ادب سے کے واقعات کی کثرت ہے۔ مذہب اور سماج کو آپ نے اختصار سے بیان کیا ہے۔

۳۔ شاہد احمد دہلوی کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا اور آپ دلّی کے گلی کُوچوں میں پلّے بڑھے اس لیے آپ کے خاکوں میں دلّی کے سماج، علم وادب کی محافل اور واقعات نے خاص جگہ پائی۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں سیاست اور مذہب سے متعلق واقعات کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ فنی اعتبار سے مولوی عبد الحق کے خاکے اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ مولوی عبد الحق کا اُسلوب صاف اور سادہ ہے۔ شوخی اور شگفتگی کم نظر آتی ہے۔ واقعات میں حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔ سراپا نگاری کو

مولوی عبدالحق نے تقریباً نظر انداز ہی کیا ہے۔

۵۔ شاہد احمد کے خاکوں میں اختصار موجود ہے۔ سراپا نگاری شاہد احمد کے خاکوں میں بدرجہ غایت پائی جاتی ہے۔ آپ کا اُسلوب تیکھا اور شوخی اور شگفتگی کا حامل ہے۔ واقعات میں تاثرات کی ملاوٹ ہے۔

۶۔ دونوں خاکہ نگاروں کے ہاں سماجی اور علمی وادبی فکر کی یکسانیت نظر آتی ہے جبکہ سیاسی اور مذہبی فکر کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے اختصار اور واقعہ نگاری میں دونوں خاکہ نگاروں میں مماثلت پائی جاتی ہے جبکہ اُسلوب اور سراپا نگاری میں واضح فرق موجود ہے۔

ج۔ سفارشات

۱۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے خاکوں میں تاریخ نگاری کے حوالے سے تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کی خاکہ نگاری کا کسی دوسری زبان کے خاکہ نگار سے بھی تقابل کرایا جاسکتا ہے۔

۳۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں تہذیبی عناصر کے حوالے سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

۴۔ مولوی عبدالحق اور شاہد احمد دہلوی ہر دو شخصیات کی بطور خاکہ نگار کے علاوہ دیگر ادبی خدمات کے حوالے سے کام کر ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات

شاہد احمد دہلوی، گنجینہ گوہر، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء

مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، انجمن ترقی اردو ہند نئی دلی ۱۹۹۱ء

ثانوی ماخذات

I۔ کتب

احمد ندیم قاسمی، سنگ دوست از اے اے حمید، مشمولہ: اے حمید کی خاکہ نگاری، جودت پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

اشفاق احمد، اجلے پھول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

امتیاز علی تاج، سیّد، انارکلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۴ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو سدب کی مختصر ترین تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، طبع اوّل، اپریل ۱۹۹۶ء

الطاف حسین حالی، یادگار غالب، آفسٹ ورکس، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

الطاف فاطمہ، تاریخ ادبیات۔۔۔(دسویں جلد) اردو ادب پنجم، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

ایوب قادری، کاروانِ رفتہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۳ء

بشیر سیفی، ڈاکٹر، خاکہ نگاری کا فن و تنقید، نذیر سنز پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء

بشیر سیفی، خاکہ نگاری: فن اور تنقید، شاخسار پبلی شرز، راولپنڈی، ۱۹۹۰ء

تحسین سروری، قومی زبان: مولوی عبدالحق اور رسالہ افسر، اگست ۱۹۶۶

احتشام حسین، سیّد، پروفیسر، عکس اور آئینے، سرفراز پریس لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۲ء

حفیظ صدیقی، ابوالاثر، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

جمیل آذر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء

راشد اشرف، اردو کے نادر اور کمیاب شخصی خاکے جلد اوّل، مرتب راشد اشرف، مشمولہ: پیش لفظ، اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء

شاہ علی، سیّد، حالی اور شبلی (سوانح نگار کی حیثیت سے) مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ، فرمان فتح پوری، عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی، ۱۹۹۴ء
صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر، خطوط رشید احمد صدیقی، ساتھیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
سلیم اختر، داکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگِ میل پبلی شرز، لاہور، ۲۰۱۱ء
سعادت حسن، منٹو، منٹو کے افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس لاہور، ۱۹۴۱ء
شمیم حنفی، پروفیسر، مقدمہ اردو خاکہ مرتب پروفیسر شمیم حنفی، مشمولہ: مقدمہ، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۹
شاہد احمد، بزمِ خوش نفساں، دیباچہ از ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء
صابرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ادب میں خاکہ نگاری، آرآر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء
صفی مرتضٰی، سیّد، اردو انشائیہ، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنو، ۱۹۶۱ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر، خطوط عبدالحق بنام عبادت بریلوی، مجلسِ اشاعت مخطوطات ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۴ء
عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء
غفور شاہ، ڈاکٹر، تعبیر حرف، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء
قدیر زمان، سوئے انشائیہ اور سوانحی انشائیے، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۰۹ء
گلنار بانو، ڈاکٹر، صوبہ سرحد میں خاکہ نگاری، گندھارا ہندکو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۱۶ء
محمد طفیل، مکرم، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۶ء
محمد عارف، سید، ڈاکٹر، شاہد احمد دہلوی حالات و آثار، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۸ء
محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء
محمد نذیر احمد، ڈاکٹر، بنات النعش، غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشرز، لاہور، ۱۹۶۵ء
محمد ہادی، مرزا، امراؤ جان ادا، کلاسک آرٹ پرنٹرس چاندی محل دریا گنج، دہلی، ۲۰۱۲ء
معین الدین، سیّد، ڈاکٹر، بابائے اردو (احوال وافکار)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء
معین الرحمن، سید، ڈاکٹر، ذکر عبدالحق، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۵ء

یحییٰ احمد، اردو میں خاکہ نگاری، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ ، فرمان پوری، عفیف پرنٹر سلال کنواں دہلی، ۱۹۹۴ء

یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، اظہار سنز پبلی شرز، حمید نظامی روڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء

II۔ مقالہ جات

عائشہ طلعت خلجی، اردو میں خاکہ نگار یکا تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ، یونیورسٹی آف دہلی، ۲۰۱۲ء

محمد علیم الدین، رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء

III۔ ڈکشنری / لغت

Oxford Dictionary of oxford press, 1976

فیروز واللغات اردو، فیروز سنز پرائیویٹ لمٹیڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء

IV۔ رسائل و جرائد

ساقی، کراچی، شاہد احمد دہلوی نمبر

V۔ ویب گاہیں

. Wikipedia.org/wiki/travelogue Dated:28-02-2019 Time:7:00 AM